معارف

جون ۲۰۱۵ء

مجلس دارالمصنّفین کا ماہوار علمی رسالہ

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

سالانہ زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۲۸۰/روپئے۔ فی شمارہ ۲۵/روپئے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۴۸۴/روپئے

دیگر ممالک میں سادہ ڈاک ۱۶۶۰/روپئے۔ دیگر ممالک رجسٹرڈ ڈاک ۱۷۸۰/روپئے

ہندوستان میں ۵ سال کی خریداری صرف ۱۳۰۰/روپئے میں دستیاب۔

(اوپر کی رقوم ہندوستانی روپئے میں دی گئی ہیں)

پاکستان میں ماہنامہ معارف کے لئے رابطہ کریں

سجاد الٰہی صاحب، 27-A لوہا مارکیٹ، مال گودام روڈ، بادامی باغ، لاہور (پاکستان)

Tel: 0300 - 4682752, (R) 5863609, (O) 7280916

Email: abdulhadi_133@yahoo.com

سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں۔

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

- زرتعاون ختم ہونے پر تین ماہ کے بعد رسالہ بند کر دیا جائے گا۔
- معارف کا زرتعاون وقت مقررہ پر روانہ فرمائیں۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

مقالہ نگار حضرات سے التماس

- مقالہ صفحہ کے ایک طرف لکھا جائے۔
- حواشی مقالے کے آخر میں دیئے جائیں۔
- مآخذ کے حوالہ جات مکمل اور اس ترتیب سے ہوں: مصنف یا مؤلف کا نام، کتاب کا نام، مقام اشاعت، سن اشاعت، جلد یا جز اور صفحہ نمبر۔

عبدالمنان ہلالی (جوائنٹ سکریٹری/منیجر) نے معارف پریس میں چھپوا کر
دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ سے شائع کیا۔

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۹۵ | ماہ شعبان المعظم ۱۴۳۶ھ مطابق ماہ جون ۲۰۱۵ء | عدد ۶

فہرست مضامین

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

شذرات

سموئیل ہنٹنگٹن نے تہذیبوں کے تصادم کا نظریہ پیش کیا تو اس کے حق میں اور اس کے خلاف بحث و تمحیص کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا اور کسی نہ کسی سطح پر اب بھی جاری ہے۔ یہ واقعہ ہے عالم اسلام کی موجودہ صورت حال کے لیے بڑی حد تک وہ طاقتیں ذمہ دار ہیں جو اس نظریہ سے متاثر ہیں اور مغرب کی سیاسی اور تہذیبی بالادستی کے لیے اسلام اور اسلامی تہذیب اور نظریہ کائنات کو سب سے بڑا خطرہ تصور کرتی ہیں۔ کمال مہارت اور ہوشیاری سے وہ عالم اسلام میں ایسے حالات پیدا کرنے میں کامیاب ہوگئی ہیں جن کے زیر اثر مسلمان خود مسلمان کے خلاف صف آرا ہیں اور ایک دوسرے کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کی خوفناک جدوجہد میں مصروف ہیں اور اسی کو اسلامی تعلیمات کا تقاضا سمجھتے ہیں۔ اس لیے اس بات میں تو شبہہ نہیں کہ عالم اسلام کی موجودہ صورت حال کے لیے بہت کچھ مغرب موردالزام ہے۔ اس کے باوجود یہ تسلیم کیے بغیر بھی چارہ نہیں کہ بنیادی طور پر مسلمان خود اس کے لیے ذمہ دار ہیں جو اپنی بے بصیرتی، ناعاقبت اندیشی اور چھوٹے چھوٹے مفادات کی خاطر آسانی سے ان سازشوں کے شکار ہوجاتے ہیں۔ فراست مومن کا کہیں سراغ نہیں۔ سرکار دوعالم ﷺ نے مومن کی ایک صفت یہ بتائی تھی کہ وہ ایک سوراخ سے دوبار نہیں ڈسا جاتا لیکن اس وقت صورت حال یہ ہے کہ مسلم قیادت ایک ہی سوراخ سے بار بار ڈسی جاتی ہے اور اس سے کوئی سبق حاصل کرنے کے بجائے اسے اپنے لیے سرمایہ افتخار تصور کرتی ہے۔ تہذیبوں کے تصادم کا معاملہ تو الگ رہا اب خود اسلامی تہذیب کے مختلف مظاہر جس طرح باہم دست و گریباں ہی نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرے کے وجود کو حرف غلط کی طرح مٹا دینے کے درپے ہیں اسے خودکشی کے علاوہ اور کیا نام دیا جاسکتا ہے۔ جس سفاکی اور بے دردی سے مسلمان مسلمان کا خون بہا رہا ہے اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ عالم اسلام کا ایک بڑا حصہ خون میں نہایا ہوا ہے۔ دکھ کی بات یہ ہے کہ ہماری اکثریت کے لیے اس کی حیثیت محض ایک خبر کی ہے جس کا کوئی قابل لحاظ اثر ہمارے اوپر اور ہمارے معمولات پر نہیں پڑتا۔ اب تو اس غم کو محسوس کرنے والے اور اس کا ماتم کرنے والے بھی نہیں رہ گئے؛ ہمارے درمیان نہ کوئی شبلی ہے اور نہ اقبال۔

مصر کی تاریخ میں یہ پہلا موقع نہیں ہے جب اس کی زمین حق پرستوں کے خون سے لالہ زار ہے۔ناصر سے حسنی مبارک تک حق کی سربلندی کے لیے جان کا نذرانہ پیش کرنے والوں کا ایک سلسلہ ہے جو سوئے دار رواں دواں نظر آتا ہے۔شیخ حسن البناء، سید قطب، عبدالقادر عودہ، حسن الہضیبی کوئی کہاں تک نام گنائے۔یہ ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔قربانی اور عزیمت کی ایک درخشاں روایت کی یہ تابندہ کڑیاں ہیں۔ان کی بے مثال کوششوں اور قربانیوں نے مصری سماج کی سوچ کے دھارے کو بدل دیا اور اس کے نتیجہ میں ۲۰۱۲ کے انتخاب میں اخوان کو بھرپور کامیابی حاصل ہوئی۔یہ مصر کی تاریخ میں ایک اہم سنگ میل تھا اور اس سے نہ صرف مصر میں بلکہ پورے خطے میں اور بالواسطہ پوری دنیا میں بڑے امکانات وابستہ تھے۔لیکن اسلام دشمن طاقتیں اسے برداشت نہ کرسکیں۔جمہوریت کا ڈھنڈورا پیٹنے والوں نے مصر میں جمہوریت کا گلا گھونٹنے میں اہم کردار ادا کیا۔ان طاقتوں کے ایک وفادار کارندہ کے طور پر السیسی نے جو کچھ کیا وہ مصر کی تاریخ میں ایک سیاہ باب کی حیثیت رکھتا ہے۔بہار عرب جس نے امیدوں، آرزوؤں اور لامحدود امکانات کی ایک نئی دنیا کی نوید سنائی تھی کسے معلوم تھا کہ وہ ایسے دردناک انجام سے دوچار ہوگی۔

آنکھوں سے جوئے خوں کے رواں دل ہے داغ داغ
دیکھے کوئی بہار گلستان آرزو

مصر کی تاریخ کے پہلے جمہوری طور پر منتخب صدر ڈاکٹر محمد مرسی کو جس طرح سزائے موت دی گئی ناطقہ سربگریباں ہے اسے کیا کہیے۔ظلم و جبر سے بھری اس دنیا میں بھی انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے کا سوانگ تو کیا جاتا ہے لیکن السیسی کے مصر میں اس کی بھی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔اب اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ جن لوگوں کو سزائے موت دی گئی ہے ان میں سے دو اس نام نہاد جرم کے وقوع سے پہلے اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے اور ایک اس وقت السیسی کے اسرائیلی آقاؤں کی جیل میں تھا۔ترکی کے علاوہ اس ظلم کے خلاف کوئی مضبوط آواز نہیں۔انصاف کی حکمرانی اور جمہوریت کی دن رات دہائی دینے والوں پر مکمل سکوت طاری ہے۔انگریزی زبان میں ایسی خاموشی کو کان پھاڑنے والی خاموشی کہتے ہیں۔مصر کے سلسلہ میں چاردانگ عالم میں ایسی خاموشی طاری ہے جس کے شور سے کانوں کے پردے پھٹے جارہے ہیں۔

معمار دارالمصنّفین مولانا سید سلیمان ندوی کے خلف الصدق اور ہمارے مخدوم ڈاکٹر سلمان ندوی (ڈربن، ساؤتھ افریقہ) کو اپنے مولد و منشا اور اپنے والد گرامی قدر کی علمی میراث دارالمصنّفین سے غیر معمولی تعلق خاطر ہے۔ وہ جب بھی ہندوستان آتے ہیں تو وقت نکال کر اور زحمت اٹھا کر یہاں ضرور تشریف لاتے ہیں۔ اس کے لیے فکر مند رہتے ہیں، اس کے کارکنوں کی حوصلہ افزائی فرماتے ہیں اور اس کی تعمیر و ترقی کے لیے مفید مشورے دیتے ہیں۔ اکیڈمی میں ان کی آمد جملہ کارکنان ادارہ کے لیے بڑی خوشی کا موقع ہوتا ہے اور ہم سب ان کی تشریف آوری کے لیے چشم براہ رہتے ہیں۔ اللہ ان کو تا دیر صحت و عافیت سے سلامت رکھے۔ دارالمصنّفین کے عہد زریں کے بس وہی ایک عینی شاہد اور یادگار رہ گئے ہیں۔ ان کے دل و دماغ میں اس دور کی یادوں کی ایک دنیا آباد ہے اور ان کے وسیلہ سے کبھی کبھی اس عہد کی ایک جھلک ہم لوگوں کو بھی دیکھنے کو مل جاتی ہے۔ دارالمصنّفین کی تعمیر استاد اور اس کی علمی اور فکری میراث سے وفاداری، عقیدت اور محبت کی ایسی دلآویز اور لازوال داستان عزیمت ہے جو آنے والی نسلوں کو حوصلہ بھی بخشتی رہے گی اور ان کی رہنمائی بھی کرتی رہے گی۔ کیسا استاد تھا جس نے ایسے شاگرد تیار کیے اور کیسے شاگرد تھے جنھوں نے استاد کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنے کے لیے اپنا سب کچھ نثار کر دیا اور آنے والی نسلوں کے لیے دور جدید کا بیت الحکمۃ ورثہ میں چھوڑ گئے جس کی تابنا کی ان کے خون جگر کی مرہون منت ہے۔

حاصل عمر نثار رہ یارے کردم
شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

اس روشن ماضی کے تابندہ روز و شب کی اس دلآویز داستان کی امین بس اب یہی ایک شخصیت رہ گئی ہے۔ اگر کسی طرح عہد گل کی یہ داستان محفوظ ہو جاتی تو ایک بڑا کام ہو جاتا

داستان عہد گل را از نظیری باز خواں
عندلیب آشفتہ تر گفت است ایں افسانہ را

پہلی مئی کو منعقد ہونے والی اکیڈمی کی مجلس انتظامیہ نے ڈاکٹر صاحب کو دارالمصنّفین کا رفیق اعزازی منتخب کیا۔

مقالات

تذکرۂ بحرزخّار کی بعض غیر مستند روایتیں

ڈاکٹر عارف نوشاہی

بحر زخّار، وجیہ الدین اشرف کا فارسی تذکرہ ہے، جس کی تصنیف میں وہ ۱۲۰۲ھ/ ۱۷۸۸ء میں مصروف تھے، لیکن اسے کب ختم کیا؟ کچھ معلوم نہیں اور نہ ہی مصنف کا سال ولادت و وفات معلوم ہے۔ ان کا وطن لکھنو (اودھ) اور مدفن جون پور بتایا گیا ہے (مقدمہ مرتب، ج ۱، ص ۲۲-۲۳)۔ بحرزخّار مختلف سلاسل طریقت، بالخصوص برصغیر پاک و ہند کے بزرگان دین کا عمومی تذکرہ ہے۔ ایک اندازے کے مطابق اس میں ۲۸۰۰ تراجم ہیں جس میں سے ۲۰۰۰ تراجم پاک و ہند سے متعلق ہیں (مقدمہ مرتب، ج ۱، ص ۲۴)۔ اب تک اس تذکرے کی دو جلدیں، پروفیسر ڈاکٹر آزرمی دخت صفوی کی ''تصحیح و تدوین'' سے شایع ہوچکی ہیں۔ دونوں جلدیں مشترکہ طور پر مرکز تحقیقات فارسی، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ اور مرکز تحقیقات فارسی رایزنی فرہنگی سفارت اسلامی ایران، دہلی نے بالترتیب ۲۰۱۲ء اور ۲۰۱۴ء میں شایع کی ہیں اور بقول مرتبہ، اس کی تیسری جلد عنقریب شایع ہوکر اس تذکرے کی اشاعت کو مکمل کردے گی۔ (وہی، ج ۲، ص ۳۲)

اس تذکرہ کے اب تک شایع ہونے والے ۶۵۹ + ۷۸۷ (۱۴۴۶) صفحات پر تبصرہ کرنے کے لیے کافی فرصت، حوصلے اور دقت نظر کی ضرورت ہے جو فی الوقت مجھے میسر نہیں ہے۔ شاید ان خوبیوں کے مالک کسی نوجوان محقق کو یہ توفیق کبھی مل جائے اور وہ اس تذکرے کے محاسن و معایب پر جامع رائے دے سکے۔ البتہ مجھے اس تذکرے کی دوسری جلد میں اپنے سلسلۂ طریقت (نوشاہیہ) کے چند بزرگوں کے حالات بغور پڑھنے کا موقع ملا ہے جو صفحات ۱۴۲-۱۴۹

ادارۂ معارف نوشاہیہ، اسلام آباد

پر موجود ہیں۔ ہمارے ہاں پنجاب میں ایک کہاوت ہے: ''دیگ میں سے ایک دانہ چکھا جاتا ہے''۔ اس سے پوری دیگ کا ذائقہ معلوم ہو جاتا ہے۔ اسی کہاوت کے مصداق، میں نے اس تذکرہ میں اپنے سلسلہ کے جن چند بزرگوں کے حالات پڑھے ہیں اور ان میں جو غیر مصدقہ روایات پائی ہیں، اس سے اس تذکرے کے بارے میں میری کوئی اچھی رائے قائم نہیں ہوئی اور میں محتاط الفاظ میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ ایک غیر مستند تذکرہ ہے جسے نہایت احتیاط سے استعمال کرنا چاہیے۔ سلسلۂ نوشاہیہ کے بزرگوں کے حالات پر، تذکرۂ بحر زخّار سے بہت پہلے چند فارسی تذکرے وجود میں آ چکے تھے، لیکن حیرت ہے کہ بحر زخار کے مصنف نے ان میں سے کسی ایک کو بھی اپنا ماخذ نہیں بنایا۔ جو مستقل تذکرے، سلسلۂ قادریہ نوشاہیہ پر موجود ہیں، ان کی زمانۂ تصنیف کے اعتبار سے تفصیل یہ ہے:

۱-احوال و مقامات نوشہ گنج بخش، میرزا احمد بیگ لاہوری، سال تصنیف ۱۱۰۷ھ/ ۹۶-۱۶۹۵ء، مطبوعہ۔

۲-ثواقب المناقب، محمد ماہ صداقت کنجاہی، سال تصنیف تقریباً ۱۱۲۶ھ/۱۷۱۴ء، نصف طبع شدہ۔

۳-تذکرۂ نوشاہیہ، محمد حیات نوشاہی، سال تصنیف ۱۱۴۶ھ/۳۴-۱۷۳۳ء، طبع شدہ۔

۴-تحایف قدسیہ، پیر کمال بن عثمان لاہوری، سال تصنیف ۱۱۸۶ھ/۱۷۷۲ء، غیر مطبوعہ۔

۵-مرآت الغفوریہ، امام بخش لاہوری، سال تصنیف ۱۱۹۰ھ/ ۱۷۷۶ء، مطبوعہ۔

۶-کنز رحمت، محمد اشرف منچری، سال تصنیف ۱۲۲۰ھ/ ۱۸۰۵ء، طبع شدہ۔

بحر زخّار میں سلسلۂ نوشاہیہ کے حسب ذیل بزرگوں کا تذکرہ ہوا ہے:

۱-حاجی محمد نوشہ (گنج بخش) بانی سلسلہ، ص ۱۴۲-۱۴۳۔

۲-بخت جمال، ص ۱۴۴۔

۳-پیر محمد سچیار، ص ۱۴۴-۱۴۵۔

۴-شاہ رحمت اللہ، ص ۱۴۵۔

۵-محمد تقی شاہ دہلوی، ص ۱۴۶۔

۶- پیر علی شیر، ص ۱۴۷-۱۴۸۔

۷- شاہ محمد رہتاسی، ص ۱۴۸۔

بحر زخّار کے مصنف نے نوشاہی بزرگوں کے حالات کے اندراج میں ''حضرت پیر شیر'' کی زبانی روایات کو ترجیح دی ہے (ص ۱۴۲، ۱۴۴، ۱۴۵)۔ اس کے علاوہ محمد اعظم لاہوری کی زبانی روایت (ص ۱۴۴) اور خلاصۃ التواریخ (ص ۱۴۸) کا حوالہ دیا ہے۔ حضرت پیر شیر کا مفصل ذکر مصنف نے ''حضرت پیر علی شیر'' (وفات: ۵/ جمادی الثانی ۱۲۰۲ھ) عنوان کے تحت الگ درج کیا ہے (ص ۱۴۷-۱۴۸) اور انہیں محمد تقی شاہ دہلوی کا بیٹا اور خلیفہ لکھا ہے۔ پیر علی شیر کے ساتھ مصنف بحر زخار کے ذاتی تعلقات تھے۔ ایک بار ۷/ جمادی الثانی ۱۲۰۱ھ کو جب پیر علی شیر، فرخ آباد سے لکھنؤ آئے تو مصنف کے گھر ٹھہرے تھے (ص ۱۴۸)۔ محمد تقی شاہ دہلوی، بقول مصنف بحر زخار، شاہ رحمت اللہ کے مرید تھے، وہ مرید پیر محمد سچیار کے، وہ مرید حاجی محمد نوشہ گنج بخش بانی سلسلہ کے۔ اس اعتبار سے پیر علی شیر بھی نوشاہی ہوئے، لیکن ہمارے خاندانی تذکروں میں ان کا نام نہیں ملتا اور نہ ہی رحمت اللہ کے مریدوں میں محمد تقی شاہ دہلوی کا نام ہے۔ بحر زخار میں رحمت اللہ شاہ کا وطن ساڈھورہ، متصل گجرات لکھا ہے جب کہ پیر محمد سچیار کے نامور خلفا میں رحمت اللہ شاہ بیگو والیہ (وفات: ۱۱۸۴ھ) کا ذکر ملتا ہے۔ یہ بیگو والا، ضلع سیالکوٹ میں واقع ہے (شریف احمد شرافت نوشاہی، شریف التواریخ، ساہن پال، ۱۹۸۳ء، جلد ۳، حصہ ۲، ص ۱۲۰-۱۵۲)

بادی النظر معلوم ہوتا ہے کہ دہلی اور اس کے اطراف میں محمد تقی شاہ اور پیر علی شیر کی نسبت سے نوشاہیہ کی ایک ایسی شاخ موجود تھی جس کے حالات ادھر مغربی پنجاب کے مورخین نوشاہیہ تک نہیں پہنچے۔ سلسلۂ نوشاہیہ کے مستند تاریخ نویس حضرت شریف احمد شرافت نوشاہی (۱۹۰۷-۱۹۸۳ء) نے خاندان اور سلسلۂ نوشاہیہ کی ضخیم تاریخ ''شریف التواریخ''، مآخذ کی ایسی جستجو کے بعد لکھی تھی جس کی نظیر نہیں ملتی۔ لیکن یہ تاریخ بھی محمد تقی شاہ اور پیر علی شیر کے ذکر سے خالی ہے۔

اب میں بحر زخار میں ان واقعات کی نشاندہی کرتا ہوں جن کی کوئی سند ہمارے تذکروں میں نہیں ہے۔ کچھ اغلاط قرات متن کے ہیں جن کی ذمہ داری مرتبہ پر عائد ہوتی ہے۔

درحالات حاجی محمد نوشہ: شاہ سلیمان کا جو شجرۂ طریقت لکھا ہے (ص ۱۴۲) وہ بالکل غلط

ہے۔افسوس اور حیرت اس بات پر بھی ہے کہ اس شجرہ میں شاہ معروف چشتی کا نام دوبارآ گیا ہے اور مرتبہ نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا! شاہ سلیمان کا درست شجرۂ طریقت یہ ہے: وہ مرید شاہ معروف چشتی قادری کے، وہ مرید شاہ مبارک حقانی اوچی کے، وہ مرید محمد غوث اوچی کے، وہ مرید شمس الدین گیلانی کے، وہ مرید شاہ میر گیلانی کے، وہ مرید علی گیلانی کے، وہ مرید مسعود گیلانی کے، وہ مرید احمد گیلانی کے، وہ مرید صفی الدین گیلانی کے، وہ مرید عبدالوہاب گیلانی کے، وہ مرید شیخ عبدالقادر گیلانی سر سلسلۂ قادریہ کے۔(تذکرۂ نوشاہیہ،۱۴)

بار بار ایک نام ''منکو'' لکھا ہے۔اس کا درست تلفظ ''منگو'' ہے۔

''مولدش چک سنھال کہ بر رود چناو داشت، بہ خانۂ گلابی رونمود۔ بدین سبب بہ اسم آنحضرت لفظ ''گلابی'' ضم است''۔(ص ۱۴۳)

اس عبارت میں کئی اغلاط ہیں۔چک سنھال یقیناً ''چک ساہن پال'' ہے جو حضرت نوشہ کا مولد نہیں، مسکن اور مدفن ہے۔ان کا مولد موضع گھوگا نوالی ہے۔چناو، چناب ہے۔گلابی، کلالی ہے۔مرتبہ نے صحیح لفظ حاشیے میں رکھا ہے اور غلط لفظ متن میں درج کیا ہے!

''بہ عمر دوازدہ سالگی بہ خدمت حضرت سلیمان ابن منکو رفت...''(ص ۱۴۳)اس کے بعد حضرت نوشہ کا واقعۂ بیعت لکھا ہے۔

حضرت نوشہ کا بارہ سال کی عمر میں شیخ سلیمان (بھلوالی) کی خدمت میں جانا، درست نہیں لکھا گیا ہے۔اگرچہ عمر کا تعین ہمارے خاندانی تذکروں میں بھی نہیں ہوا ہے لیکن حضرت نوشہ کے واقعات زندگی کا جو تسلسل ان تذکروں میں پایا جاتا ہے اس سے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے آپ بارہ سال کی عمر سے بڑے تھے کہ مرید ہوئے۔بحر زخار کے مصنف نے بیعت ہونے کا جو واقعہ بیان کیا ہے وہ سراسر من گھڑت ہے اور اب تک کسی کتاب میں نہیں دیکھا گیا۔

حضرت نوشہ کے خلفا میں سے، شاہ عبدالرحمٰن پاک بھڑی والے کے نام کے ساتھ لقب ''چھاپہ گیر'' لکھا ہے(ص ۱۴۳)اس سے کیا مراد ہے؟ کچھ معلوم نہیں۔ہمارے تذکروں میں ایسا کوئی لقب ان کے نام کے ساتھ نہیں ملتا۔سب نے ان کا پیشہ گاذری (کپڑے دھونا) لکھا ہے۔

حضرت نوشہ کے ایک خلیفہ کا نام شاہ نہال اور ان کے مجاہدے کے بارے میں لکھا ہے

(ص ۱۴۳)۔ ہمارے خاندانی تذکروں میں حضرت نوشہ کے مریدوں میں سے شاہ نہال کی بجائے ایک نام چوہدری نہالا مانگٹ ملتا ہے جس کا ذکر اپنے شیخ کی مسجد کی تعمیر میں ایک خادم کی حیثیت سے ہوا ہے۔

حضرت نوشہ کے ایک خلیفہ کا نام حاجی عبدالرحمٰن دہلوی لکھا ہے (ص ۱۴۳)۔ یہ حضرت کے راست خلیفہ نہیں تھے بلکہ حضرت نوشہ کے خلیفہ پیر محمد سچیار کے مرید تھے۔ محمد ماہ صداقت کنجاہی صاحب ثواقب المناقب انہی حاجی عبدالرحمٰن کے مرید تھے اور ان کے مستند حالات ثواقب میں ملتے ہیں۔

درحالات حضرت بخت جمال: ''الولد سرّ لابیہ حضرت بخت جمال خلف وخلیفۂ حضرت حاجی نوشہ''۔ (ص ۱۴۴)

مصنف بحر زخار کی نہایت بے خبری ہے کہ وہ بخت جمال کو حضرت نوشہ کا بیٹا اور خلیفہ لکھ رہے ہیں۔ بخت جمال، محمد بیگ کے بیٹے اور پیر محمد سچیار کے خلیفہ تھے۔ ان کا زمانہ حضرت نوشہ سے بعد کا ہے اور حضرت نوشہ کی وفات (۱۰۶۴ھ) سے ٹھیک سو سال بعد ۱۱۶۴ھ میں فوت ہوئے۔ (شریف التواریخ، ج ۳، ح ۲، ص ۵۲)

درحالات پیر محمد: ''حضرت حاجی نوشہ را پسران بودند مثل حضرت بخت جمال وشاہ تتھے''۔ (ص ۱۴۴)

بخت جمال اور شاہ تتھے کو حضرت نوشہ کا بیٹا لکھنا سراسر غلط اور گمراہ کن ہے۔ حضرت نوشہ کے دو بیٹوں کا نام محمد برخوردار اور محمد ہاشم تھا۔

پیر محمد سچیار کی بیماری کے عالم میں سب خادموں کا ان کا ساتھ چھوڑ جانے کا پورا واقعہ ہمارے تذکروں میں نہیں آیا اور غیر معتبر ہے۔

درحالات شاہ پیر محمد انباسی (کذا: رہتاسی): بحر زخار میں ان کی نسبت ''انباسی'' اور حاشیے میں ''رہتاسی'' نقل ہوئی ہے۔ ان کو حضرت حاجی محمد نوشہ کا مرید لکھا ہے اور خلاصۃ التواریخ اور رسالہ مبدا و معاد کے حوالے سے ان کے بارے میں کچھ باتیں لکھی گئی ہیں۔ ہمارے خاندانی تذکروں میں حضرت حاجی محمد نوشہ کے ایک عزیز مرید وخلیفہ، شاہ محمد رہتاسی کا ذکر ملتا ہے لیکن ان

کے بارے میں کوئی ایسی بات جو بحر زخّار میں درج ہے، ہمارے تذکروں میں نہیں ہے۔

بحر زخار کی مرتبہ نے ہر دو جلد پر جو مقدمہ لکھا ہے اس میں مضامین کی تکرار ہوئی ہے۔ مثلاً دونوں جلدوں میں مقدمہ کے اندر بھی کتاب کے مضامین کی فہرست دی ہے اور الگ سے ''فہرست'' بھی تیار کی ہے جو دونوں جلدوں کے شروع میں موجود ہے۔ دونوں جلدوں میں زیر استعمال قلمی نسخوں کا تعارف ایک جیسا لکھا ہے، سوائے ایک نسخہ کے جو بعد میں ملا۔ دوسری جلد کے مقدمہ میں صرف اس نو دریافت نسخے کا تعارف کافی تھا۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ کتاب کے معائب اور محاسن پر بھرپور بات ہوتی، لیکن چند عمومی تعریفی جملوں کے علاوہ، مرتبہ نے کچھ نہیں لکھا اور اس تذکرے کی کمزوریوں پر بات نہیں کی ہے۔ اگر خارجی مآخذ سے مصنف کے حالات نہیں ملتے تو جو حالات تذکرے کے اندر جا بجا بکھرے ہیں ان کو ہی یکجا کر لیا جاتا، لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔ مثلاً مقدمہ میں اس بات کا ذکر نہیں ملتا کہ مصنف کے حضرت پیر علی شیر سے ذاتی تعلقات تھے اور ۱۱۲۰ھ میں وہ لکھنو میں ان کے میزبان تھے (جلد۲، ص ۱۴۷)۔ میر محمد نعمان بدخشی نے آگرہ میں مصنف کے دادا کو زرنگار بنانا سکھایا تھا۔ بعد میں یہی فن مصنف کے خاندان میں نسل در نسل چلا آیا (ج۲، ص ۵۸۹)۔ مرتبہ نے مصنف کے جو حالات درج کیے ہیں ان کا ماخذ بھی نہیں بتایا۔ مرتبہ نے مصنف کی قبر جون پور میں بتائی ہے۔ اس سے میرا دھیان ان کے ایک ہم نام شیخ وجیہہ (کذا)/ وجہہ (کذا) الدین اشرف معروف بہ شیخ فرید کی طرف جاتا ہے جو محمود شاہ شرقی (حکومت: ۸۴۴-۸۶۲ھ/ ۱۴۴۰-۱۴۵۸ء) کے مشیر سلطنت بھی رہے تھے۔ ان کا مزار جون پور میں ہے۔ جون پور کی معاصر تاریخوں- تاریخ سلاطین شرقی اور صوفیائے جونپور از سید اقبال احمد جونپوری؛ تاریخ شیراز ہند جونپور از سید اقبال احمد- میں ان کے حالات ملتے ہیں۔ ظاہر ہے اس روایت کے مطابق دونوں کا زمانہ مختلف ہے۔ مرتبہ کو جونپور کے حوالے سے نام کی اس مماثلت پر بھی غور کرنا چاہیے۔

بحر زخار کی مرتبہ کے تدوینی فرائض میں شامل تھا کہ مصنف کے مآخذ و منابع کی تخریج کرتیں اور اپنے مقدمہ میں ان منابع کی فہرست دے کر اس پر بحث کرتیں، لیکن مطبوعہ دونوں جلدوں کے مقدمے میں تو ایسا نہیں ہوا ہے، شاید تیسری جلد کے مقدمہ میں ایسا کر دیں۔ مرتبہ نے

مصنف کے مآخذ کی کراس چیکنگ (cross checking) بھی نہیں کی تا کہ واقعات و روایات کی تائید یا تردید ہوجاتی۔

تذکرے میں بھی بہت سے واقعات ایسے درج ہوئے ہیں جو لوگوں نے مصنف سے بیان کیے۔ تدوین کا تقاضا تھا کہ مرتبہ ایسے تمام راویوں کی ایک فہرست اپنے مقدمے میں شامل کرکے اس پر جرح کرتیں۔

مرتبہ نے قلمی نسخے پڑھنے میں بھی تساہل سے کام لیا ہے۔ اگر وہ لفظ اعلام میں سے ہے تو اس کی تحقیق کسی دوسرے ماخذ سے نہیں کی۔ بعض مقامات پر تو غلط لفظ کو متن میں رکھا ہے اور صحیح لفظ، اختلاف نسخہ کے طور پر حاشیے میں درج کیا ہے۔ مرتبہ نے پروف ریڈنگ بھی باریک بینی سے نہیں کی جس سے کتابت کی کئی اغلاط درآئی ہیں اور متن غیر معتبر ہوگیا ہے۔ چند مثالیں:

جلد ا، مقدمہ، صفحہ ۴۴: میر لطف اللہ بلگرامی کا تخلص ''سحر'' لکھا ہے، جب کہ یہ ''بیخبر'' ہے۔ یہ سراسر قراءت متن کی غلطی ہے۔ کاش میر آزاد بلگرامی کے تذکرے مآثر الکرام اور سرو آزاد ہی دیکھ لیے جاتے۔ بے خبر بلگرامی کی تصانیف غبار خاطر اور سفینۂ بے خبر معروف ہیں۔

جلد ۲، ص ۱۴۸: متن میں محمد انباسی لکھا ہے اور حاشیے میں محمد رہتاسی، انباسی غلط اور رہتاسی درست ہے۔

جلد ۲، ص ۵۴۵: یعقوب چرخی کی نسبت مکانی نفحات الانس کے حوالے سے ''جرج'' لکھی ہے۔ مرتبہ نے نہ تو نفحات کھول کر دیکھی اور نہ یہ غور کیا کہ اگر نام کے ساتھ ''چرخی'' ہے تو جگہ کا نام بھی ''چرخ'' ہونا چاہیے۔ لیکن موصوفہ نے اسے ''جرج'' پڑھا اور لکھا ہے۔ چرخ، نواح غزنہ میں واقع ہے جہاں کے یعقوب چرخی تھے۔

ج ۲، ص ۵۴۵: ''خواجہ عبداللہ احرار''، ان کا نام ''عبیداللہ'' ہے اور ہر تذکرے (نفحات، رشحات) میں ایسا ہی لکھا ہے۔ لیکن مرتبہ نے دقت نظر سے کام لیے بغیر آگے چل کر بھی ہر جگہ اسے ''عبداللہ'' ہی لکھا ہے۔ اتنے معروف نقشبندی بزرگ کا نام غلط لکھنا افسوسناک ہے! اگر یہ مصنف یا کاتب کی غلطی تھی تب بھی مرتبہ کو درست کردینا چاہیے تھی۔

ج ۲، ص ۵۴۷: ''بر جبینش بیاضی دیدم'' اور حاشیے میں نسخہ بدل ''جنبش'' لکھا ہے۔ یہ

دونوں غلط ہیں اور ''جبینش'' درست ہے یعنی پیشانی پر سفیدی کا داغ دیکھا۔

ج ۲،ص ۵۵۱: کاسہ (پیالہ) کا املا دوبار ''کانسہ'' لکھا ہے۔ یہ کاتب کا ملفوظی املا تو ہوسکتا ہے، معیاری املا نہیں ہے۔

ج ۲،ص ۵۵۸: ''خاوندظہور''، صحیح نام خاوندطہور ہے۔

ج ۲،ص ۵۵۹: ''اخذ فوائد از والا بزرگوار خود نمود'' یہاں والا کی جگہ والد ہونا چاہیے۔

ج ۲،ص ۵۵۹: ''مولانا ہندو خواجہ ترکستانی در رشحات نویسد'' اس عبارت کا سیدھا سا مطلب تو یہ ہے کہ مولانا ہندو خواجہ ترکستانی رشحات میں لکھتے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ رشحات عین الحیات علی بن حسین واعظ کاشفی کی تصنیف ہے اور اسی کتاب سے متعلقہ حالات بھی نقل ہوئے ہیں۔ مرتبہ نے اس عبارت کی نارسائی اور کجی پر غور نہیں کیا اور جوں کا توں نقل کردیا ہے۔

ج ۲،ص ۶۲۱: مولانا خواجگی احمد کی نسبت ''کاشانی'' لکھی ہے۔ صحیح نسبت ''کاسانی'' ہے یہ کاسان فرغانہ ہے اس کا کاشان ایران سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

مرتبہ اپنے مقدمہ میں ''لکھنو'' کا املا ئی مقامات پر ''لاکنو'' لائی ہیں (ج ۱،ص ۲۲،۲۳)۔ اگر مرتبہ پر ایرانی املا کا اثر ہے تب بھی ''لکنو'' ہونا چاہیے تھا۔

تذکرۂ بحر زخار کی مرتبہ ڈاکٹر ناہید آذرمی دخت صفوی سے میری نیازمندی بہت پرانی ہے۔ سطور بالا میں جو گزارشات پیش کی گئی ہیں اس کا بنیادی مقصد زیر بحث تذکرے کی کچھ غیر مستند روایات کی نشاندہی کرنا تھا۔ اس ضمن میں اگر کچھ باتیں اس تذکرے کی تصحیح و تدوین کی کمزوری پر درمیان میں آگئی ہیں تو مجھے امید ہے ڈاکٹر صاحبہ اپنی بلند نظری کے پیش نظر اس میں سے بھی مثبت پہلو تلاش کریں گی۔ میرا مقصد ان کی دل شکنی یا سبکی ہرگز نہیں ہے۔ امید کرنی چاہیے کہ مرتبہ، تذکرۂ بحر زخار کی تیسری جلد بہتر انداز میں مرتب کرکے پیش کریں گی۔

دُرِ فشاندَن یا دُر چیدَن

مختلف زبانی اسلوب کے موقف

ڈاکٹر لیلیٰ عبدی خجستہ

پرانی فارسی میں ایک ضرب المثل ہے: ''اگر فی المثل دُر فشاندَن ندانی ہمہ حال دُر چیدَن آخر توانی'' (روبک، ۱۸۲۴ء، حصہ اول، ص ۱۰۰)۔ الفاظ میں ایک جوہری قدرت پوشیدہ ہے۔ بولنے والے موقع ومحل کے لحاظ سے اپنے الفاظ کا انتخاب کرتے ہوئے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہیں۔ زیرتحریر مضمون میں ''اسالیب زبان'' پر بحث کی جائے گی۔ اس میں سب سے پہلے اس پر روشنی ڈالی جائے گی کہ ''زبانی اسلوب'' کیا ہے؟ پھر اس کی روشنی میں زبان کے ''معیاری'' اور ''غیر معیاری'' اسالیب اور ان کی مختلف شاخوں کو بحث میں شامل کیا جائے گا اور کچھ مغربی لسانی اصطلاحات کی رو سے زبانی اسالیب پر روشنی ڈالی جائے گی۔

زبان، انسانی کردار کی سب سے واضح شکل ہے۔ جیسے کہ اعلیٰ، متوسط اور نچلے طبقوں کے افراد کا انداز زندگی مختلف ہوتا ہے ویسے ہی ان کے الفاظ اور انداز بیان بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ زبان والوں کو اپنی زبان کے کم از کم دو اسلوب اپنانا آتے ہیں: ایک وہ جو بے تکلفانہ ماحول میں اپنے دوستوں کے ساتھ استعمال کرتے ہیں اور دوسرا وہ جسے سنجیدہ اور رسمی گفتگو میں اختیار کرتے ہیں۔ ان دونوں میں ملحوظ فرق، الفاظ اور جملوں کی ساخت کا ہوتا ہے۔ پہلے اسلوب میں قواعد بہت لچک دار ہوتے ہیں یہاں تک کہ ان میں قواعد کی غلطیاں بھی ملتی ہیں۔ اس میں الفاظ تیزی، زور، روانی اور بے ساختگی کے ساتھ بولے جاتے ہیں۔ جب کہ دوسرے اسلوب میں

سندھ یونی ورسٹی، جام شورو، حیدرآباد (سندھ)۔

صحت الفاظ وجملوں کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔یعنی بولنے والے گفتگو کرتے وقت الفاظ کے استعمال میں تین باتوں کا خیال رکھتے ہیں: زمان، مکان اور مخاطب۔ظاہر بات ہے کہ کچھ الفاظ ومحاورات دوستانہ محفلوں کے ہوتے ہیں۔ہماری روزمرہ زندگی میں بار بار اس قسم کے الفاظ بولے اور سنے جاتے ہیں:

''کہنا''/''بتانا''/''عرض کرنا''/''فرمانا''۔''اس سے لے لو!''/''اس سے مانگ لو!''/ ''ان سے درخواست کرنا''/''ان سے گزارش کرنا''۔

جب ہم کسی سے گفتگو کرتے ہیں تو ہمیں اچھی طرح سے معلوم ہوتا ہے کہ کون سا لفظ، کہاں، کس کے ساتھ اور کس طرح استعمال کرنا ہے۔درج ذیل تین لغات سے ان اصطلاحات کی اردو تشریح، ہر اصطلاح کی بحث کے آغاز میں واضح کی جائے گی:

''قومی۔انگریزی اردو لغت''، جمیل جالبی (طبع اول، ۱۹۹۲ء)۔

''آکسفورڈ انگلش۔اردو ڈکشنری''، شان الحق حقی (طبع اول، ۲۰۰۳ء)۔

''فرہنگ اصطلاحات لسانیات انگریزی۔اردو''، عامر علی خان (طبع اول، ۲۰۱۰ء)۔

۱- زبانی اسلوب: زبانی اسلوب سے مراد وہ اسلوب ہے جسے کسی ایک زبان کے بولنے والے ،حسب موقع ومحل، مخاطب کی شان ومنزلت اور سماجی رتبہ کا لحاظ کرتے ہوئے زبان و بیان اور بولنے کے انداز (اسلوب) کا انتخاب کرتے ہیں۔چنانچہ زبانی اسلوب میں لفظ کے انداز بیان اور اخلاقی ، معاشرتی اور تاریخی استعمال کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔الفاظ میں ایک قدرتی قوت ، پوشیدہ ہوتی ہے۔اسی قوت کے امکانات کوٹٹولنا اور اس سے کام لینا، زبان کے بولنے والوں کے کمال کی دلیل ہے۔چنانچہ لسانیات میں زبانی اسلوب کی تین بڑی شاخیں پائی جاتی ہیں: معیاری زبان، غیر رسمی زبان اور غیر معیاری زبان۔

معیاری زبان (standard language): شُستہ اور سلیس زبان ہے اور رسمی موقعوں پر اپنائی جاتی ہے۔اس میں: تعظیمی زبان اور رسمی زبان شامل ہیں۔

غیر رسمی زبان: یہ معیاری اور غیر معیاری اسلوب کے درمیان کی زبان ہے اور جہاں تکلف کچھ کم ہو وہاں اپنائی جاتی ہے۔اس میں محاورات سے زیادہ کام لیا جاتا ہے۔

غیر معیاری زبان: یہ اسلوب بے تکلفانہ ماحول میں استعمال کیا جاتا ہے جہاں لوگ ایک دوسرے کے ساتھ اپنائیت محسوس کرتے ہیں۔ اس میں: سلینگ (slang)، جارگوں (jargon)، آرگو (argot)، کینٹ (cant) اور ٹیبو (taboo) شامل ہے۔

ان تین اسالیب زبان کی تشریح سے پہلے، سنجیدہ اور بے تکلف ماحول کے اسلوب اپنانے کا فرق، دو مثالوں سے واضح کیا جاسکتا ہے۔ ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی نے (پ: ۱۹۳۴ء) اپنی کتاب: ''لغاتِ روزمرہ'' (ا) میں مندرجہ ذیل الفاظ پر وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے: (لغاتِ روزمرہ، ۲۰۰۳ء، ص ۴۹۔ ۱۳۳)

اڑوس پڑوس: یہ لفظ عام بے تکلف بول چال تک کے لیے تو ٹھیک ہے، لیکن اسے سنجیدہ گفتگو و تحریر میں نہ لانا چاہیے۔ اس کے بجائے ''پاس پڑوس'' استعمال کریں۔

دھر پکڑ: یہ فقرہ ہمیشہ مزاحیہ، طنزیہ یا پھر بے تکلف گفتگو میں استعمال ہوتا ہے۔ سنجیدہ یا وزنی معاملات میں اس کا دخل، نامناسب ہے۔ نامناسب کی مثال: واردات کے بعد، مجرموں اور مشکوک لوگوں کی دھر پکڑ شروع ہوئی۔

مناسب کی مثال: واردات کے بعد، مجرموں اور مشکوک لوگوں کی گرفتاریاں تیزی سے شروع ہوئیں۔

۲: معیاری زبان (standard language): معیاری یعنی کوئی مانا ہوا پیمانہ یا درجہ یا مثال جس کی پیروی متوقع ہو یا تعلیم یافتہ، شائستہ طبقے کی زبان۔

معیاری زبان کو اردو میں ''ٹکسالی زبان'' بھی کہتے ہیں اور لسانی اصطلاح میں اس سے مراد وہ مرکزی ادارہ، شہر یا مقام ہے جہاں کی زبان پورے ملک کے لیے معیار سمجھی جاتی ہو۔ یہ ایسا زبانی اسلوب ہے جو کسی ملک کے سرکاری یا غیر سرکاری تعلیمی اداروں میں اپنایا جاتا ہے۔ اخبارات اور متون، اسی اسلوب میں لکھے جاتے ہیں۔ ذرائع ابلاغ، سمیناروں، علمی اور رسمی نشستوں میں یہی زبان استعمال کی جاتی ہے۔ ''یہ زبان کی توسیع و تہذیب کا مرکز ہو''۔ (کشاف تنقیدی اصطلاحات، ۱۹۸۵ء، ص ۵۲) یعنی یہ ایک غالب (dominant) زبان ہے۔ چنانچہ ''یہ اسلوب، تعلیمی اور ابلاغی (میڈیا) مقاصد کے لیے اختیار کیا جاتا ہے''۔ (کرسٹل، ۲۰۰۱ء، ص ۳۶۶) اس

میں عامیانہ بول چال سے پرہیز کیا جاتا ہے۔اس میں صحیح قواعد، تلفظ اور رسم الخط کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔الفاظ پوری طرح ادا کیے جاتے ہیں۔مثلاً عام گفتگو میں کہتے ہیں: ''تم کاں جارے او''؟ جب کہ معیاری زبان میں کہیں گے: ''تم کہاں جا رہے ہو''؟ دنیا بھر میں کتابوں کے ذریعے معاشرے میں افراد کو معیاری زبان کی ترغیب دی جاتی ہے۔اردو میں: ''نکات سخن'' (حسرت موہانی، ۱۹۲۵ء)، ''غلط العوام اور متروک الکلام'' (مولوی محمد منیر لکھنوی، ۱۹۳۰ء) (۲) اور اس سلسلے کا اخیر نمونہ، ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی کی ''لغات روزمرہ'' (۲۰۰۳ء) کو قرار دیا جاسکتا ہے۔ (۳) اور فارسی میں یہ کتابیں ملتی ہیں: ''غلط ننویسیم۔فرہنگ دشواری ہای زبانِ فارسی'' (ابوالحسن نجفی، طبع اول، ۱۹۸۸ء) (۴) اور ''مبانی دُرست نویسی زبان فارسی معیار'' (ناصر نیکو بخت، ۲۰۱۱ء) نیز انگریزی میں درج ذیل کتابیں زیادہ مشہور ہیں:

- Funk & Wagnalls Company,"A Standard Dictionary of the English Language", (first edition:1894)
- Fowler, H.W, "A Dictionary of Modern English Usage", (first edition:1926)
- Hudson, Nicholas, "Modern Australian Usage", (1993)

۲: ۱- تعظیمی زبان (deferential language): ''قومی۔انگریزی اردو لغت'': تعظیمی؛ مودبانہ (ص ۵۳۵)۔''آکسفورڈ انگلش۔اردو ڈکشنری'': مؤدبانہ، فدویانہ (ص ۳۹۴)۔''فرہنگ اصطلاحات لسانیات انگریزی۔اردو'': پیکر (ص ۵۷)

تعظیمی زبان (۵)، معیاری زبان کے مقابلے میں اعلیٰ قرار دی جاتی ہے۔جہاں بولنے والے اور مخاطب کا سماجی رتبہ اعلیٰ ہوتا ہے وہاں تعظیمی زبانی اسلوب اختیار کیا جاتا ہے۔مثلاً صحافتی انٹرویوز میں کسی وزیر، سفیر یا گورنر کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے نہایت احترام واحتیاط سے الفاظ کا انتخاب کیا جاتا ہے۔اس اسلوب میں طریقۂ بیان کا بھی بہت خیال رکھا جاتا ہے اور سلینگ سے پرہیز کیا جاتا ہے۔اس میں تکلفاتی اور انکسارانہ انداز زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔مثلاً ''آپ ہمارے گھر پر آیئے گا!'' کی جگہ یوں کہتے ہیں کہ ''آپ ہمارے غریب خانے پر تشریف

لا ئیے گا!'' اردو میں اس اسلوب کے لیے فارسی اور عربی الفاظ زیادہ تر استعمال کیے جاتے ہیں۔ مثلاً: ''آپ کا نوازش نامہ موصول ہوا''۔ بجاے: ''آپ کا خط ملا''/ ''محترم ومکرم تشریف رکھیے!'' بجاے: ''آپ بیٹھ جائیے!''۔

۲:۲-رسمی زبان (formal language): ''قومی۔انگریزی اردو لغت'': پڑھے لکھے مقرروں اور ادیبوں کے استعمالِ زبان کے اس اسلوب کے مطابق جس میں عوامی اور عام اصطلاحات سے گریز کیا جاتا ہے اور مخففات ومحذوفات تک بھی تحریر وتقریر میں استعمال نہیں کیے جاتے (ص ۷۸۰)۔ ''آکسفورڈ انگلش۔اردو ڈکشنری'': ۱-رسمی، رواج، طور طریقے کے مطابق، پرتکلف۔ ۲-حسب دستور، اصلی۔ ۳-خوش ترکیب۔ ۴-تکلفات۔ ۵-بے روح، بے جان، ظاہری، مصنوعی۔ ۶-واضح، حتمی، باضابطہ۔ ۷-تسلیم شدہ طریقے کے مطابق۔ ۸-ہیئت وصورت سے تعلق رکھنے والا ظاہری، صوری (ص ۶۱۹)۔ ''فرہنگ اصطلاحات لسانیات انگریزی۔اردو'': پیکری زبان (ص ۸۲)۔ اس کے علاوہ ''آکسفورڈ ڈکشنری آف سینونمز اینڈ انتھونمز'' رسمی زبان کے درج ذیل مترادفات ومتضادات یوں ملتے ہیں (۲۰۰۷، ص ۸۹)۔

syn: ceremonial, ritualistic, ritual, conventional, traditional, stately, solemn, elaborate

opp: informal, friendly, casual, colloquial, unofficial

جہاں مخاطب کا سماجی رتبہ بلند ہوتا ہے وہاں رسمی زبان اختیار کی جاتی ہے۔ اس میں سلینگ الفاظ وعبارات سے پرہیز کیا جاتا ہے۔ الفاظ اور جملے وہ نہیں ہوتے جو ہم اپنی روزمرہ زندگی میں استعمال کرتے ہیں۔ اس میں اہتمام اور آورد ہوتا ہے۔ صحیح قواعد اور تلفظ کا خیال رکھا جاتا ہے۔ مثلاً: ضمیر ''آپ'' اپنے پورے فعل کے ساتھ استعمال کی جاتی ہے۔ (بعض اوقات، روزمرہ زندگی میں ضمیر دوم حاضر جمع ''آپ'' فعل واحد حاضر سے بولا جاتا ہے۔ ''آپ چلے جاؤ!'' لیکن رسمی زبانی اسلوب میں: ''آپ چلے جائیے!'' کہا جاتا ہے) نیز چن چن کے الفاظ لیے جاتے ہیں۔ مثلاً اردو میں ''تعلیم حاصل کرنا'' بجائے: ''پڑھنا''/ ''ملاحظہ کرنا'' بجائے: ''غور کرنا'' یا مثلاً: غیر رسمی موقعوں میں اکثر لوگ ایک دوسرے کو مخاطب کرتے ہوئے ''یار'' بولتے ہیں لیکن

رسمی موقعوں پر، اس لفظ کے بولنے سے پرہیز کیا جاتا ہے۔

رسمی انداز بیان تجارتی، ادارہ جاتی، اور تعلیمی خطوط میں استعمال کیا جاتا ہے جہاں مخاطب سے گفتگو کرنے کے ساتھ ساتھ محترمانہ، سنجیدہ، خوش گوار، سلیس اور بالواسطہ الفاظ و عبارات کی ضرورت ہوتی ہے۔ "جہاں سنجیدہ موضوع جیسے: قانون اور مذہب کے بارے میں بات ہو رہی ہو تو وہاں اکثر لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ رسمی الفاظ کو اپنایا جائے۔ (پیٹرز، ۲۰۰۴ء، ص ۱۹۲) چنانچہ یہ الفاظ و عبارات صاف اور واضح ہوتے ہیں اور ذو معنی و کنایہ دار نہیں ہوتے ہیں۔ "رسمی زبان میں لوگوں کا مقام، منزلت، عزت، احترام، وقار ملحوظ ہوتا ہے۔ غالباً یہ تصور ہوگا کہ "تعظیمی" اور "رسمی" زبان ایک ہی ہیں۔ جب کہ "تعظیمی" اور "رسمی" زبانی اسلوب میں کچھ نازک سے فرق بہر حال ہے۔

"تعظیمی اسلوب" میں کبھی احترام و صمیمیت ایک دوسرے کے ساتھ چلتی ہیں، جب کہ "رسمی اسلوب" میں احترام و وقار۔

"تعظیمی اسلوب" میں مخاطب کو بزرگ اور خود کو چھوٹا سمجھا جاتا ہے نیز منکسرانہ رویہ اختیار کیا جاتا ہے، جب کہ "رسمی اسلوب" میں سب کے ساتھ یکساں انداز گفتگو اختیار کیا جاتا ہے۔

"تعظیمی اسلوب میں" کبھی کبھار احترام کے ساتھ اپنائیت محسوس ہوتی ہے جب کہ "رسمی اسلوب" میں احترام اور بیگانگی ہوتی ہے۔ "وہ لوگ جو عام موقعوں پر رسمی (یا تعظیمی) اسلوب اختیار کرتے ہیں، اپنے مخاطب کو بیگانہ، غیر اور اپنوں سے باہر (خواہ بلحاظ سماجی رتبہ یا تعلیمی سطح پر بلند مرتبہ) سمجھتے ہیں اور جن کے درمیان تکلف حائل ہوتا ہے"۔ (پیٹرز، ۲۰۰۴ء، ص ۵۱۶)

۳: غیر رسمی زبان (informal language): "قومی۔ انگریزی اردو لغت":

بے ضابطہ؛ غیر رسمی؛ بے قاعدہ؛ غیر سرکاری؛ آسان؛ رسمی تحریر یا مقالہ کی ضد (ص ۱۰۰۴)

"آکسفورڈ انگلش۔ اردو ڈکشنری": ۱- غیر رسمی، آپس کا، بے تکلفانہ ۲- معمولی، روزمرہ کا (ص ۸۶)۔ "فرہنگ اصطلاحات لسانیات انگریزی۔ اردو": بے ضابطہ (ص ۱۰۹)۔

اردو میں اسے "روزمرہ زبان" کہا جا سکتا ہے۔ یہ اسلوب روزمرہ زندگی اور بول چال

میں اختیار کیا جاتا ہے اور اس میں علمی، ادبی یا رسمی الفاظ نہیں اپنائے جاتے ہیں۔ یعنی معیاری زبان سے کم درجے کی حیثیت اور غیر معیاری سے اونچے درجے کی حیثیت کا حامل ہے۔ یہ اسلوب جہاں اپنالیا جاتا ہے وہاں تکلف اور رسمیت کم ہوتی ہے۔ لوگ ایک دوسرے سے زیادہ قربت محسوس کرتے ہیں۔ حقیقت میں: ''یہ اسلوب، لوگوں کے معاشرتی تجربات، ثقافتی، تہذیبی، اخلاقی پس منظر اور تعلیمی ماحول پر منحصر ہے''۔ (پیٹر ٹج، ۱۹۳۳ء، ص ۷۵) اس اسلوب میں قیاس کو (زیادہ) دخل نہیں بلکہ سماعت پر دارو مدار ہے۔ اور اس میں قواعد اور تلفظ کی غلطیاں پائی جاسکتی ہیں۔ مثلاً: ضمیر دوم حاضر جمع ''آپ''، فعل دوم حاضر مفرد سے بولا جاتا ہے۔ ''آپ چلے جاؤ!''۔ جب کہ تعظیمی/رسمی زبانی اسلوب میں یہ کہتے ہیں: ''آپ چلے جائیے!'' فارسی میں بھی یہ اسلوب رائج ہے۔ ''شُما برو!'' (جب کہ قواعدی لحاظ سے صحیح یہ ہے: ''شُما بروید!'')

اس اسلوب میں بعض اوقات کوتاہ اور مختصر الفاظ، تخفیف کیے گئے الفاظ اور تلمیحی الفاظ اختیار کیے جاتے ہیں جن کا پس منظر، بولنے والے اور سننے والے دونوں کو معلوم ہوتا ہے۔ ''اس اسلوب کو اپنانے میں ہو بہو اور لفظ بلفظ معانی سمجھنے کی خواہش نہیں ہوتی بلکہ کل مفہوم مراد ہوتا ہے''۔ (پیٹرز، ۲۰۰۴ء، ص ۱۱۴) روزمرہ زندگی میں اس اسلوب کا زیادہ اور وسیع پیمانے پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس اسلوب کا ذخیرۂ الفاظ وسیع ہے۔ اس میں: تابعات (جیسے: لاڈ پیار۔ دکھ سکھ۔ کپڑے وپڑے)، ضرب الامثال (جیسے: جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے)، محاورات (جیسے: ''انتظار کرنا'' کی جگہ: ''راہ دیکھنا'') وغیرہ سے زیادہ کام لیا جاتا ہے۔

اردو اسالیب میں دو اصطلاحیں ملتی ہیں: ''محاورہ'' اور ''روزمرہ''۔ اس حوالے سے برج موہن دتاتریہ کیفی (۱۸۶۶۔۱۹۵۵ء) اور وارث سرہندی (۱۹۳۴۔۱۹۹۱ء) کی آرا کے تناظر میں ان دو اصطلاحات پر روشنی ڈالی جائے گی۔

''وہ کلام جس کے الفاظ اپنے غیر موضوعی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں محاورہ ہے۔ محاورہ کم از کم دو کلموں سے مرکب ہوتا ہے۔ یہ جو کہا گیا ہے کہ اکثر محاوروں کی بنیاد استعارے پر ہوتی ہے درست نہیں معلوم ہوتا۔ استعارے کی جگہ تمثیل کہا جائے تو مضائقہ نہیں۔ محاورہ کسی قسم کے تصرف یعنی کمی بیشی یا تغیر کی مداخلت کو برداشت نہیں کرتا''۔ (کیفی، ۱۹۴۲ء، ص ۱۷۸۔۱۷۹)

''روزمرہ بیان کے اس اسلوب اور بول چال کو کہتے ہیں جو اہل زبان استعمال کرتے ہیں اس کے خلاف استعمال غلط سمجھا جاتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جو کلام صرف ونحو کی رو سے بالکل صحیح ہو وہ روزمرہ کی رو سے غلط ہوتا ہے''۔ (ایضاً، ص ۱۷۶۔۱۷۷)

وارث سرہندی نے بھی ''روزمرہ'' کو اہل زبان کا استعمال کہہ کر لکھا ہے: ''بعض الفاظ قواعد کی رو سے صحیح ہوتے ہیں مگر اہل زبان انھیں اس طرح استعمال نہیں کرتے تو وہ روزمرہ کے خلاف ہوں گے اور صحیح ہوتے ہوئے بھی پایۂ فصاحت سے ساقط ہوں گے۔ بعض اوقات اہل زبان کے استعمال سے معانی میں خصوصیت پیدا ہوجاتی ہے اور روزمرہ میں کسی لفظ کے معنی خاص ہوجاتے ہیں جو، اسی قبیل کی اور تراکیب کے مفہوم سے الگ معنی دینے لگتا ہے۔ مثلاً: نامراد اور بے مراد''۔ (سرہندی، ۱۹۸۹ء، ص ۸۳)

کیفی اور سرہندی کے نزدیک ''محاورے'' اور ''روزمرہ'' کے درمیان نمایاں فرق ہیں: ''محاورہ قواعد کی خلاف ورزی کبھی نہیں کرتا اور روزمرہ قواعد کے راستے سے ہٹ کر چلتا ہے''۔ (کیفی، ۱۹۴۲ء، ص ۱۷۷) ''محاورے میں الفاظ اپنے حقیقی معنی سے ہٹ کر یعنی مجازی معنی میں استعمال ہوتے ہیں لیکن روزمرہ میں الفاظ کا حقیقی معنی سے تعلق برقرار رہتا ہے۔ روزمرہ میں قواعد کی خلاف ورزی تو ہوجاتی ہے مگر لغوی معنی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا ہے''۔ (ایضاً، ص ۸۳۔۸۴)

۴: غیر معیاری زبان (non-standard language)(۶): ''قومی۔ انگریزی اردو لغت'': غیر معیاری، تحریری یا تقریری زبان سے متعلق جو عام طور پر مسلمہ چلن کے مطابق نہ ہو (ص ۱۳۲۳)۔ ''آکسفورڈ انگلش۔ اردو ڈکشنری'': غیر معیاری (ص ۱۰۹۸)۔ ''فرہنگ اصطلاحات لسانیات انگریزی۔ اردو'': غیر معیاری (ص ۱۵۷)۔

اردو زبان میں اسے ''ٹکسال باہر'' بولتے ہیں۔ یعنی: ''غیر معیاری یا غیر مستند'' (سرہندی ۱۹۸۶ء، ج ۲، ص ۱۰۱) یہ ایک ایسا زبانی اسلوب ہے جو روزمرہ زندگی میں عام گفتگو میں گلی کوچوں میں اپنوں اور دوستوں کے ساتھ بلا تکلف استعمال کیا جاتا ہے۔ اس اسلوب میں عموماً محاورات اور عامیانہ بول چال سے زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ جب کہ رسمی موقعوں پر، اعلیٰ رتبہ وشان والی

شخصیات اور رسمی تحریروں میں اس کے استعمال سے اجتناب کیا جاتا ہے۔ اردو اسالیبِ زبان میں ''بازاری زبان'' یا ''سوقیانہ زبان'' اس کے دائرۂ تعریف میں شامل ہیں اور ان کا استعمال مکروہ سمجھا جاتا ہے۔اس حوالے سے ''قاموس الفصاحت'' (۱۹۷۳ء) کی مثالیں ملاحظہ ہوں:

آنکھیں سینکنا: عورتوں کو بری نظر سے دیکھنا، گھورنا، بار بار دیکھنا اور دیکھے چلے جانا، بدنظری۔ یہ عامیانہ محاورہ ہے اور استعمال میں ذم ہے (ص ۹۸)۔

تماشا بین: طوائف باز یا طوائف کے گھر آنے جانے والے کا اصطلاحی نام ہے۔ یہ مرکب لفظ مفرد لفظ ''تماشائی'' کا ہم معنی یا بدل نہیں ہے۔اس میں کھلا ہوا ذم ہے۔ یہ لفظ بازاری زندگی سے متعلق ہے اور ہمیشہ مکروہ معنی ہی میں استعمال ہوتا ہے (ص ۴۲)۔

جتنے کالے اتنے میرے باپ کے سالے: اپنی چیز سے ملتی جلتی ساری چیزوں کو اپنا سمجھنا۔ کالے اور سالے ہم قافیہ ہیں۔ عامیانہ محاورہ ہے (ص ۳۵)۔

چھان پر پھونس نہ ہونا: مفلس قلانچ، کوڑی کوڑی محتاج ہونا، ایسا مفلس جو اپنے چھپّر پر پھونس بھی نہ ڈلوا سکے۔ دہقانی محاورہ ہے (ص ۴۳)۔

۴:۱۔۱۔ سلینگ (slang): ''قومی ۔ انگریزی اردو لغت'': عوامی الفاظ؛ وہ زبان زد الفاظ و تراکیب جو زیادہ پُر وضاحت، استعاراتی، پہلودار، بے لگی لپٹی، ناشائستہ اور نادیر پا ہوتے ہیں بہ مقابلہ ان کے جن کو ٹکسالی کہا جاتا ہے؛ کسی مخصوص گروہ کی بولی؛ عامیانہ بولی؛ سوقیانہ لہجہ (ص ۱۸۶۱)۔ ''آکسفورڈ انگلش ۔ اردو ڈکشنری'': عامیانہ بولی، بے تکلفانہ بولے جانے والے عوامی الفاظ، فقرے وغیرہ یا جو کسی خصوص موضوع یا کسی مخصوص گروہ سے تعلق رکھتے ہوں (ص ۱۶۱۷)۔ ''فرہنگ اصطلاحات لسانیات انگریزی ۔ اردو'': عامیانہ زبان (ص ۲۱۴)۔

سلینگ کا مفہوم ادا کرنے کے لیے بالعموم: ''عامیانہ الفاظ و محاورات'' / ''بازاری زبان'' / ''سوقیانہ الفاظ و محاورات'' / ''عوامی الفاظ و محاورات'' / ''ناشائستہ الفاظ'' / ''مبتذل زبان'' / ''غیر ثقہ الفاظ و محاورات'' جیسی عبارتیں ملتی ہیں۔ (اولین اردو سلینگ لغت، ۲۰۰۶ء، ص ۱۰) چنانچہ سلینگ گذشتہ دور میں ''ولگر زبان'' (۷) سمجھا جاتا تھا اور چوروں، بدمعاشوں، خانہ بدوشوں اور ریڑی، پھیری، سبزی اور پھل والوں کی زبان کے لیے مخصوص تھا۔

آج کل یہ درمیانی اور نچلے طبقوں کا اسلوب سمجھا جاتا ہے۔ جہاں لوگ ایک دوسرے سے بہت قریب ہونے کا محسوس کرتے ہیں اور ان میں تکلف بالکل نہیں ہوتا۔ فحش اور پھبتیوں کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔ وسیع پیمانے پر لوگوں میں اس کا استعمال ہے۔ سلینگ کے بارے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ بولنے والوں کے لیے ایک قابل فہم زبان ہے جب کہ اس حلقے کے باہر افراد کے لیے ایک پیچیدہ اور نا قابل فہم زبان ہے۔ اپنوں میں ایک متعارف اور شائستہ زبان ہے۔ جب کہ باہر والوں کے لیے یہ ایک نا متعارف اور نا شائستہ زبان سمجھی جاتی ہے۔ سلینگ میں: معیاری زبان، پرانے اور جدید الفاظ اور دوسری زبانوں، اشیا وغیرہ سے کام لیا جاتا ہے (۸) نیز "بعض اوقات سلینگ کی حدیں: ٹیبو اور فحش سے جا ملتی ہیں"۔ (پیٹرز، ۲۰۰۴ء، ص ۵۰۲) مثال کے طور پر درجِ ذیل الفاظ اور ان کے مستعمل سلینگ ملاحظہ کیجیے:

اردو سلینگ از "اولین اردو سلینگ لغت" (رؤف پاریکھ، ۲۰۰۶ء)۔

معیاری لفظ	سلینگ
بدمعاش، غنڈہ	بھائی لوگ، ٹپوری لوگ
بہت پریشان کرنا، بہت شرمندہ کرنا	واٹ لگانا
بے وقوف، احمق	بلب، ٹیوب لائٹ
پھبتی کسنا	لائن مارنا
تیز اور چالاک آدمی، جوڑ توڑ کا ماہر	جگاڑو
حلیہ بگاڑ دینا	پلستر بگاڑ دینا
دھوکے باز، فریبی	دس نمبری
رشوت	بھتہ
سخت پٹائی، شدید مار پیٹ	دھنائی

فارسی سلینگ از "فرہنگ شفاہی سخن" (طبع اول، ۲۰۱۰ء)۔ (۹)

واژہ	واژۂ عامیانہ
آدمِ ہیچ	آدمِ سِہ پیچ

باحیلہ وِنیرَنگ اَزکسی پول گرِفتن	تیغ زَدَن
چاقو	تیزی
دَرکارِخوداُستادبودَن (اِندِ رفاقت، اِندِ دُروغ)	اِندِ چیزی بودَن
دَربارۂ کسی اطّلاعاتِ کامل داشتن	آمارِ کسی راداشتن

انگریزی سلینگ از ''چیمبرز ڈکشنری'' (تینتھ ایڈیشن، ۲۰۰۷ء)۔

slang	word
pigeon	dupe or simpleton
block	head
cop	policeman

۴:۱۔۲۔سلینگ اور رسمی زبان کا فرق: اس موقع پر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ''سلینگ'' اور ''رسمی زبان'' کے فرق کو واضح کیا جائے۔

رسمی زبان	سلینگ
اس کی پائداری زیادہ ہے۔	اس کی عمر ناپائیدار ہے۔
براہ راست زبان ہے۔	بلاواسطہ زبان ہے۔
اس میں سلاست اور صفائی ہے۔	اس میں کنایاتی اور ذو معنی الفاظ ملتے ہیں۔
اس میں شمولیت ہے اور ہر جگہ بولی جاسکتی ہے۔	محدود اشخاص یا علاقوں میں بولی جاسکتی ہے۔
ہر کوئی اسے سمجھ سکتا ہے۔	اپنوں کے علاوہ دیگر افراد نہیں سمجھ سکتے ہیں۔
اس میں تکلف اور اجنبیت ہے۔	اس میں بے تکلفی اور اپنائیت ہے۔
اس میں سنجیدگی ہے۔	اس میں مزاح و تفریح ہے۔
اس میں یکسانیت ہے۔	اس میں رنگارنگی ہے۔
ساختہ زبان ہے۔	خودساختہ زبان ہے۔
باہر کی زبان ہے۔	اندر کی زبان ہے۔

کسی حد تک ایک جامد اسلوب ہے۔	کسی حد تک ایک متحرک اسلوب ہے۔

ملحوظ رہے: ”ہر غیر رسمی لفظ، سلینگ نہیں ہوتا لیکن ہر سلینگ لفظ، یقیناً غیر رسمی ہوتا ہے“۔ (اولین اردو سلینگ لغت، ۲۰۰۶ء، ص ۱۲) اس حوالے سے یہ مثالیں ملاحظہ کیجیے:

اردو:

معیاری اردو	غیر رسمی	سلینگ
بدمعاش	آوارہ، ٹپوری	لچّا، لفنگا، لوفر
بہت اور فضول باتیں کرنا	سر کھانا	دماغ کی چٹنی (دہی) بنانا
کمنٹ پاس کرنا	چھیڑنا	لائن مارنا
کھانا، نوش فرمانا	لینا، کھانا	ٹھونسنا، دعوت اڑانا، ہڑپ کرنا

فارسی:

معیاری	غیر رسمی	عامیانه
سکوت کَردَن	ساکت شُدَن	خَفِه شُدَن
صُحبَت کَردَن	حَرف زَدَن	وِر زَدَن
میل کَر دَن	خُوردَن	لُمبوندَن

انگریزی: (۱۲)

standard	colloquial	slang
man	chap	bloke, cove, cully, guy, stiff, bozo
clergyman	parson	amen wallah, fire escape, holy Joe, sky pilot

گذشتہ زمانے میں بعض ماہرین (لغت نویس) ”سلینگ“ اور ”پیشہ ورانہ عبارات“ (جارگوں) کا فرق نہیں سمجھ پاتے تھے۔ سلینگ ان معنوں میں بھی استعمال کیا جاتا تھا: ”جارگوں“، ”آرگو“

اور ''کینٹ''۔ چنانچہ ہینری واٹسن فالر نے (۱۸۵۸۔۱۹۳۳ء) جارگوں کے مترادفات میں یہ سب اصطلاحات درج کیں تھیں۔ (فالر، ۱۹۲۶ء، ص ۳۰۷)

اس حوالے سے مرحوم مولوی عبدالحق (۱۸۷۰ء۔۱۹۶۱ء) رقم طراز ہیں کہ: ''ہماری لغات میں علوم وفنون تو ایک طرف، عام پیشوں اور صنعت ودست کاری تک کے معروف لفظ بھی نہیں ملتے۔ غالبًا یہ ٹکسال باہر سمجھے جاتے ہیں۔ شعرا ہماری زبان کے ٹکسالی اور ادب کی سند خیال کیے جاتے تھے اور جو لفظ ان کے کلام میں نہیں ملتا تو لغت میں شامل نہیں ہوتا''۔ (عبدالحق، ۱۹۷۳ء، ج ۱، ص ۵۱) اردو میں مولوی محمد منیر لکھنوی کی لغت: ''بازاری زبان واصطلاحات پیشہ وران'' (۱۹۳۰ء) میں ''بازاری زبان'' (سلینگ) کے ساتھ ساتھ جارگوں بھی ملتے ہیں۔ جیسے: بیرٹوں، پالییوں، جواریوں، چرسیوں، دلالوں، فقیروں، فیل بانوں، قصائیوں، کمہاروں اور موچیوں کی اصطلاحیں۔ یعنی اس دور میں ان طبقوں کے تکنیکی الفاظ ''بازاری زبان'' کے ذیل میں شمار کیے جاتے تھے۔ (۱۳)

۲:۴- جارگوں (jargon): ''قومی۔ انگریزی اردو لغت'': اصطلاح پیشہ وران؛ کسی خاص طبقہ، پیشہ یا کام کی اصطلاح یا زبان (ص ۱۰۵۳)۔ ''آکسفورڈ انگلش۔ اردو ڈکشنری'': ۱- کسی خاص طبقے کی مخصوص اصطلاح یا بول چال کے الفاظ، گروہی بولی۔ ۲- بول جو پلّے نہ پڑیں، جناتی زبان (ص ۸۵۳)۔ ''فرہنگ اصطلاحات لسانیات انگریزی۔ اردو'': گروہی اصطلاح (ص ۱۱۷)۔

جارگوں اصل میں ایک فنی اور تکنیکی اصطلاح ہے جو مختلف پیشوں کے لوگ اپنے کاروباری بنا پر استعمال کرتے ہیں۔ ڈرائیور، دکان دار، ڈاکٹر وغیرہ اپنی حرفت اور ضرورت کے مطابق جارگوں استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً پاکستان میں لوکل بسوں میں ایک جارگوں بہ کثرت سنائی دیتا ہے: ''ڈبل ہے''۔ لوکل بس کا کلینر، ڈرائیور کو ہدایت دینے کے لیے بس کی چھت یا دروازے پر زور زور سے دو مرتبہ ہاتھ مار کے آواز لگاتا ہے: ''استاد! ڈبل ہے''۔ یعنی: ''جانے دو!'' جب کہ ایک مرتبہ ہاتھ مار کے آواز کا مطلب ہے: ''رک جاؤ!'' جارگوں کی بنا پر: ہر پیشے میں غور وخوض اور کام کی رفتار بڑھ جاتی ہے۔ چنانچہ ان الفاظ کی مدد سے زندگی کو سہولت فراہم کی جاتی ہے۔ جارگوں

کے مترادفات میں: ’’مشکل لفظ‘‘، ’’خاص زبان‘‘ اور ’’ماہرانہ زبان‘‘ لکھتے ہیں۔ (ڈکشنری آف لیکز یکوگرافی، ۱۹۹۸ء، ص ۸۷) آج کل کمپیوٹر کی بہت سی تکنیکی اصطلاحات ہماری زبان میں داخل ہوئی ہیں: ’’پیسٹ‘‘، ’’ڈیلیٹ‘‘، ’’کاپی‘‘، ’’ماؤس‘‘ وغیرہ۔ (۱۴) یا اردو میں ’’ٹانکے ڈھیلے کرنا‘‘ اور ’’بخیے اُدھیرنا‘‘ پہلے یہ صرف درزیوں کے طبقے تک محدود تھے۔ لیکن اب اردو بولنے والا وہ خواہ کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتا ہو انھیں بلاتکلف استعمال کرتا ہے ’’ٹانکے ڈھیلے کرنا‘‘ (بمعنی: بدحواس ہونا) اور ’’بخیے اُدھیرنا‘‘ (بمعنی: راز فاش کرنا) یہ محاورے مستند زبان کا حصہ بن گئے ہیں۔ موجودہ دور میں اردو میں پیشوں کی خاص خاص اصطلاحات، مختلف اداروں اور اشخاص نے تحریر کی ہیں۔ اردو میں ’’جارگوں‘‘ کی بہترین مثال ہے: ’’فرہنگ اصطلاحات پیشہ وران‘‘ از: مولوی ظفر الرحمٰن دہلوی، آٹھ جلدیں۔ (۱۵)

جارگوں اس وقت غیر معیاری زبان کے ذیل میں شامل ہوتا ہے جب ہم کسی خاص پیشہ یا علم کی اصطلاحات کو اپنی بلاتکلف گفتگو میں شامل کریں اور حظ ولطف کو دوبالا کریں۔ یعنی کاروباری، صنعت اور حرفت کے علاوہ جارگوں ایسا لسانی وسیلہ ہے جہاں ہمیں خوشی اور تفریح بھی مل جاتی ہے۔ جارگوں ہماری گفتگو کی ظرافت اور وسعت خیال میں اضافہ کر دیتا ہے۔ ڈیوڈ کرسٹل (پ: ۱۹۴۱ء) کی رائے میں جارگوں کے اس استعمال کی وجہ یہ ہے کہ: ’’قدرتی طور پر ہم سب کو صاحبان پیشہ اور ماہرین علوم میں شامل ہونے کی خواہش ہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ہمیں دوسروں کی معلومات پر رشک آتا ہے۔ چنانچہ ہماری یہ کوشش ہوتی ہے کہ اپنی روزمرہ زندگی میں ان کی خاص اصطلاحات وعبارات کو اختیار کریں۔ خواہ انہیں سمجھیں یا نہ سمجھیں نتیجتاً ان ماہرین کا اسلوب اور انداز بیان، کبھی طنزیہ اور مزاحیہ صورت میں اپنا لیا جاتا ہے‘‘۔ (کرسٹل، ۲۰۰۱ء، ص ۱۷۴) مثلاً اردو میں ’’اسکریو‘‘ ایک میکانکی اصطلاح ہے۔ بعض اوقات جب کسی کو مزاحیہ انداز میں کہا جاتا ہے کہ: ’’وہ پاگل ہے‘‘ تو اس اصطلاح کو یوں استعمال کیا جاتا ہے: ’’اس کے دماغ کے اسکریو ڈھیلے ہیں‘‘۔ ایک اور مثال: ’’کرائے کا ٹٹّو‘‘۔ یہ اس صورت میں استعمال ہوتا ہے کہ جب کسی ٹیم میں کوئی کھلاڑی کم زور ہو اور کپتان یہ سمجھتا ہو کہ اس کم زور کھلاڑی کی وجہ سے وہ میچ ہار جائے گا تو وہ کسی اور ٹیم کے کھلاڑی کو پیسے دے کر اپنی ٹیم میں شامل کر لیتا ہے۔

کرسٹل اپنی کتاب: ''دی کیمبرج انسائیکلوپیڈیا آف دی انگلش لینگویج''میں جارگوں کی بحث چھیڑتے ہوئے یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ:''جب جارگوں ہماری زندگی کا ایک حصہ ہے تو ہم کیوں اسے بری نظروں سے دیکھتے ہیں؟ اور کیوں یہ اصطلاح کبھی مثبت معنوں میں نہ ہی سمجھی اورنہ ہی بولی جاتی ہے؟'' اورآگے وہ خوداس کا جواب دیتے ہیں: (کرسٹل، ۲۰۰۱ء، ص ۱۷۴)

الف: بعض اوقات جارگوں وہاں استعمال کیا جاتا ہے جہاں اس کی ضرورت بھی محسوس نہیں ہوتی۔ چنانچہ بات پیچیدہ ہوجاتی ہے اور سننے والے الجھن کا شکار ہوجاتے ہیں۔

ب: بعض لوگ دکھاوے کے لیے جارگوں استعمال کرتے ہیں جب کہ انھیں الفاظ و عبارات سمجھ میں نہیں آتے۔

ج: بعض لوگوں کے لیے جارگوں ایک آسان طریقہ ہے تاکہ اپنی کم فہمی اور نالائقی کو چھپاسکیں۔

د: جارگوں کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ وہ جماعت جو غیرقانونی کاموں میں ملوث ہوتی ہے اپنے اپنے جارگوں استعمال کرتی ہے تاکہ دوسروں کوسمجھ نہ آئیں اور وہ قانون کی گرفت سے آزاد رہتے ہوئے خاموشی سے اپنے غیرقانونی کاروبار کوآگے بڑھاتے رہیں۔ جرائم پیشہ لوگ مثلاً چور، نشہ آور اشیاء کی تجارت کرنے والے، اسمگلر وغیرہ یہ نہیں چاہتے کہ کوئی اوران کے جارگوں سے واقف ہواوران کا استعمال کرے۔ یہ جارگوں، ان کے لیے ایک ''خفیہ کوڈ'' کی حیثیت رکھتے ہیں جس کے پھیلنے سے ان کا سارا کاروبار درہم و برہم ہوسکتا ہے اور وہ قانون کی گرفت میں آسکتے ہیں۔ چنانچہ جارگوں پہلے دور میں ''سلینگ'' کے معنوں میں استعمال کیا جاتا تھا۔

ھ: دوسری طرف، ماہرین علوم اورصاحبانِ پیشہ کواس لیے برا لگتا ہے کہ دیگر لوگ، جارگوں کے استعمال سے ان کے علوم اور پیشوں کو معمولی اور عادی دکھانا چاہتے ہیں۔ عام لوگ ایسے میدان میں قدم رکھتے ہیں جس کے بارے میں انھیں کوئی واقفیت نہیں ہوتی۔ ان کے لیے یہ پیشہ ورانہ اصطلاحات، بے ہودہ، فضول اور مسخرے پن (gobbledegook) کا جواز بن جاتی ہیں۔

و: دنیا کا کوئی بھی موضوع ناقابلِ بحث نہیں اور اس سے متعلق بحث پر بھی کوئی پابندی

نہیں۔"لیکن سیاست، اشتہارات اور خفیہ عسکری ادارے ایسے موضوعات بن چکے ہیں کہ جہاں جارگوں سب سے زیادہ استعمال کیے جاتے ہیں۔ اس بات پر اعتراضات بھی کیے گئے ہیں۔ تاہم مزے کی بات یہ ہے کہ یہ میدان اس لیے منتخب کیا جاتا ہے کہ یہاں زیادہ تر جھوٹ، فریب، تذبذب اور ڈر نظر آتا ہے۔ یہ ایک طے شدہ بات ہے کہ سیاست دان، اشتہار لگانے والے اور خفیہ ادارے وہ خاص گروہ ہیں جو، اس لسانی اسلوب کو زیادہ استعمال کرتے ہیں اور ان کا صرف ایک ہی مقصد ہوتا ہے: اپنی باتیں معاشرے کے لوگوں کے ذہنوں میں اتارنا اور عوام کو اپنے اغراض و مقاصد کے لیے تیار کرنا"۔ (کرسٹل، ایضاً) یعنی جارگوں معاشرے کو فریب دینے کے لیے ان کے لیے بہترین لسانی وسیلہ ہے۔

۴:۳- آرگو (argot): "قومی۔ انگریزی اردو لغت": چور بولی؛ ٹھگ بولی؛ چوروں اچکوں کی مخصوص بولی؛ کوئی بھی خود ساختہ بولی جو کسی مخصوص طبقے میں مروج ہو؛ عامیانہ بولی (ص ۱۰۳)۔ "آکسفورڈ انگلش۔ اردو ڈکشنری": کسی طبقے یا حلقے کی مخصوص بولی؛ پہلے یہ لفظ خصوصاً جرائم پیشے طبقے کی بولی کے لیے استعمال کرتے تھے (ص ۶۲)۔ "فرہنگ اصطلاحات لسانیات انگریزی۔ اردو": چور بولی (ص ۱۵)۔

۴:۴- کینٹ (cant): "قومی۔ انگریزی اردو لغت": بازاری زبان؛ مخصوص گروہوں مثلاً خانہ بدوشوں کی خفیہ بولی؛ کسی خاص جماعت، پیشے یا فرقے کے لیے مخصوص فقرے یا بولی (ص ۲۸۱)۔ "آکسفورڈ انگلش۔ اردو ڈکشنری": (۳) کسی طبقے، پیشے وغیرہ کی مخصوص بولی یا اصطلاح (ص ۲۰۲)۔ "فرہنگ اصطلاحات لسانیات انگریزی۔ اردو": گروہی بولی (ص ۳۳)۔

آرگو: پہلے یہ "دنیائے زیریں کی زبان" (the language of under world) جرائم پیشہ افراد اور چوروں کی زبان کہی جاتی تھی۔ لیکن آج کل ایک کسی گروہ یا انجمن کی زبان ہے۔ مثلاً اکیڈمیک آرگو (پیٹرز، ۲۰۰۴، ص ۴۷)

کینٹ: یہ بھی آرگو کے مترادفات میں شمار کیا جاتا ہے۔ یعنی جرائم پیشہ افراد کی نجی زبان۔ (۱۶)

مثلاً اردو میں بھائی لوگوں کی زبان میں یہ الفاظ ملتے ہیں: "پیٹی" (=ایک لاکھ روپے)/

''ٹپکانا'' (= جان سے مارنا)، ''خاموش کرنا''، ''سُلا دینا'' (= قتل کرنا)، ''سامان'' (= آتشیں اسلحہ جیسے پستول)، ''سرکٹ'' (= کام دوسروں کو بانٹ دینا)، ''فنٹر'' (= چمچہ)، ''فیوز ہونا'' (= ناکارہ ہونا)، اردو میں کینٹ (یا آرگو) کی بہترین مثال ''مصطلحات ٹھگی'' ہے جس میں ٹھگوں کی خفیہ زبان جمع کی گئی ہے اور ولیم۔ ایچ۔ سلیمن نے (۱۷۸۸-۱۸۵۶ء William.H.Sleeman) اپنے مددگار علی اکبر الہ آبادی کے ساتھ مرتب کی، یہ ۱۸۳۹ء میں شائع ہوئی۔

ایک نجی اور خاص زبان اپنانے کی کئی وجہیں ہیں: ''اصل اور حقیقی بات کو چھپانا، اوروں کو واقفیت سے دور رکھنا یا اپنے آپ کو ماہر اور صاحب علم دکھانا۔'' (ڈکشنری آف لیکز یکوگرافی، ۱۹۹۸ء، ص ۷۸) چناں چہ کرسٹل ایسی زبانوں کو: ''ایک خفیہ زبان اور پوشیدہ گفتگو (speech disguise) کہتے ہیں۔'' (کرسٹل، ۱۹۹۲ء، ص ۲۷)

۴:۵-''سلینگ''، ''جارگوں''، ''آرگو'' اور ''کینٹ'' کی مشابہت اور تفاوت۔

۴:۵۔۱-''سلینگ''، ''جارگوں''، ''آرگو'' اور ''کینٹ'' کی مشابہتیں۔

غیر رسمی زبان کے ذیل میں شامل ہو جاتی ہیں۔ خاص اور محدود گروہوں اور پیشوں میں بولی جاتی ہیں۔ عام لوگوں اور ہم جولیوں کی زبان ہے۔ اسی گروہ کے اندر، معمولی اور قابل فہم زبان ہے۔ اسی گروہ سے باہر، عجیب، غیر معمولی اور ناقابل فہم زبان ہے۔ معیاری زبان سے دور ہیں۔ خودساختہ زبان ہیں۔ یہ زبانیں، گروہ کو محفوظ رکھتی ہیں۔ یہ زبانیں، گروہ کی خوداعتمادی کا سبب بن جاتی ہیں۔

۴:۵ ۔۲-''سلینگ''، ''جارگوں''، ''آرگو'' اور ''کینٹ'' میں تفاوت۔

سلینگ: اس کے الفاظ وعبارات زیادہ محدود اور خاص نہیں۔
وسیع پیمانے کے لوگوں کے استعمال میں ہے۔
ان تینوں کی بہ نسبت دیگر لوگوں کے لیے قابلِ فہم بولی ہے۔

جارگوں: تکنیکی زبان ہے۔ ہر کسی علم یا پیشے کی اپنی اپنی اصطلاحات ہوتی ہیں۔
ماہرین علوم و پیشہ وروں میں سمجھی جاتی ہے۔
اپنے گروہ میں سمجھی جاتی ہے۔

آرگو: بڑے محدود گروہ میں بولی جاتی ہے۔خاص طور پر وہ گروہ،جن کی موجودگی معاشرے کے لیے ڈرانے والی ہوتی ہے۔

جرائم پیشہ لوگوں اور خفیہ جماعتوں کی زبان ہے۔جیسے: دہشت گرد، ghetto گروہ، بازاری گینگ (street gang)۔

اپنے گروہ میں سمجھی جاتی ہے۔

کینٹ: مترقی اور پیش رفتہ زبان سمجھی جاتی ہے۔

پیشہ ورانہ اصطلاح ہے۔

اپنے گروہ میں سمجھی جاتی ہے۔

۵- ٹیبو (taboo, tabu): ''قومی۔انگریزی اردو لغت'': معاشرتی رسم کے مطابق ممنوعہ،قابل حرمت یا ممنوع قرار دینے کی حقیقت؛کسی چیز کی حرمت،عمل یا استعمال سے اخراج؛ سماجی راہ و رسم سے اخراج؛ معاشرتی مقاطعہ؛ رسم تحریم؛ امتناع؛ ممنوع،حرام (ص ۲۰۲۷)۔ ''آکسفورڈ انگلش۔اردو ڈکشنری'': ۱-کسی شخص یا شے کو حرام یا حلال،نجس یا پاک قرار دینے کا رواج، دستور یا عمل۔۲- بندش، ممانعت، تحدید، کسی شے کو شجر ممنوعہ قرار دینے کا عمل (ص ۱۷۷۶)۔''فرہنگ اصطلاحات لسانیات انگریزی۔اردو'': کلمۃ الحرام (ص ۲۳۱)۔

ٹیبو سے مراد وہ الفاظ ہیں: ''جن کا استعمال معاشرتی اور تہذیبی اسباب کی بنا پر نا قابل قبول سمجھا جاتا ہے۔مثلاً جنس کے متعلق الفاظ۔'' (ڈکشنری آف لیکزیکوگرافی،۱۹۹۸ء،ص ۱۳۷) سلینگ کے ذیل میں اس بات کا اشارہ کیا گیا کہ سلینگ الفاظ و محاورات کا بڑا حصہ ٹیبو الفاظ ہیں۔

۶: اسالیب زبان اور ہماری ذہنیت: یہ تصور ایک حد تک عام تھا کہ معیاری زبان ''اچھی''، ''پاکیزہ'' اور ''نفیس'' ہوتی ہے۔''گذشتہ صدی تک غیر معیاری اسلوب کو 'نادرست اسلوب زبان' (incorrect language) کہا جاتا تھا اور تحریر یا تقریر میں اس کے استعمال سے اجتناب کیا جاتا تھا۔لیکن کچھ ناولوں کے مکالموں میں یہ احتیاط نہیں ملتی۔آج کل، دنیا کی ہر زبان میں غیر رسمی زبانی اسلوب، نہ صرف بولنے والوں کے لیے بے تکلفانہ ماحول فراہم کرتا ہے بلکہ کسی بھی تصنیف میں قاری اور مصنف کے درمیان ذہنی فاصلہ بھی کم کر دیتا ہے''۔

(پیٹرز، ۲۰۰۴ء، ص ۵۱۶) پہلے یہ عام تصور تھا کہ معیاری اسلوب، غیر معیاری اسلوب سے بہتر اور اعلیٰ ہے۔ لیکن اب یہ تصور درست نہیں رہا۔ اس لیے کہ ہر اسلوب، اپنی اپنی جگہ پر درست استعمال ہوتا ہے۔

''آر۔ ایچ۔ ڈی کے ان ابریجڈ ایڈیشن'' کے مرتبین نے لغت کے مقدمے میں لکھا ہے کہ: ''غیر معیاری اسلوب، معیاری اسلوب کے موازنے سے بہتر ہے اور نہ بدتر بلکہ جس بات کا خیال رکھنا چاہیے وہ یہ ہے کہ موقع ومحل کا لحاظ کرتے ہوئے مناسب الفاظ کا انتخاب کریں۔ ایک تعلیم یافتہ بولنے والا معیاری اسلوب have not کو غیر معیاری اسلوب haven't میں تبدیل کرسکتا ہے۔ نیز ایک ناخواندہ بولنے والا آسانی سے غیر معیاری اسلوب I seen / I done gone کو I have went / I have saw میں بدل سکتا ہے''۔ (۱۹۸۳ء، ص xxii) نیز ''آر۔ ایچ۔ ڈی کے ان ابریجڈ کے دوسرے ایڈیشن'' میں ایک اہم نکتے کی نشاندہی بھی کی گئی ہے کہ: ''بعض اوقات بول چال میں غیر معیاری الفاظ، تاثیر اور زور دینے کے لیے نہایت سنجیدہ موقعوں پر بھی استعمال ہوجاتے ہیں''۔ (۱۹۸۷ء، ص xxiii) ''آر۔ ایچ۔ ڈی''، The Random House Dictioanry of the English Language کا مخفف عنوان ہے، غیر معیاری اسلوب کو ''گذشتہ لغت نویس 'colloquial' کہتے تھے۔ وبسٹرز کے تیسرے ایڈیشن (۱۹۶۱ء) میں اس کے لیے لفظ 'informal' کا انتخاب کیا گیا۔ اس لیے کہ قارئین کو 'colloquial' سننے میں 'derogatory' لگتا تھا''۔ (بورک فیلڈ، ۲۰۰۴ء، ص ۱۵۹)

یہی تصور اردو زبان میں بھی ملتا تھا (اور ہے)۔ گذشتہ دور میں الفاظ دو بڑے گروہ میں منقسم تھے۔ ''فصیح'' اور ''غیر فصیح''، جس سے مراد ''صحت الفاظ'' تھی یعنی تلفظ، قواعد، محل، الفاظ کا چناؤ اور املا مدنظر رکھا جاتا تھا۔ اس حوالے سے اردو کے لغات میں کثرت سے مواد مل جاتا ہے۔ (البتہ علاقے کے حساب سے بھی فصاحت کی تعریف میں تبدیلی آتی تھی جیسے: دہلی اور لکھنؤ تاہم ہر علاقے میں وہاں کے اعلیٰ خاندانوں کی زبان فصاحت کا معیار مانا جاتا تھا)

فصیح	غیر فصیح
معاشرے کے اعلیٰ طبقے کی زبان۔	معاشرے کے نچلے طبقے کی زبان۔

درباریوں اور ادیبوں کی زبان۔

ان کو مہذب اور شائستہ طبقے سمجھتے تھے۔

ان کی زبان ٹکسالی اور مستند قرار دی جاتی تھی۔

ان کی زبان میں صحت الفاظ کا بڑا خیال رکھا جاتا تھا۔

ان کی زبان میں فارسی اور عربی الفاظ فخر اور کثرت سے اختیار کیے جاتے تھے۔

بازاری، عوام، گنوار۔

ان کو غیر مہذب اور جاہل سمجھتے تھے۔

ان کی زبان ٹکسال سے باہر اور غیر مستند قرار دی جاتی تھی۔

ان کی زبان میں قواعد اور تلفظ کی بڑی غلطیاں پائی جاتی تھیں۔

ان کی زبان میں مقامی الفاظ کثرت سے استعمال کیے جاتے تھے اور بیگانہ زبانوں کو اپنے اپنے حساب سے بولتے تھے۔

اردو میں دو اصطلاحیں اور بھی ملتی ہیں ''غلط العام'' اور ''غلط العوام''۔ مرحوم سرہندی نے ان کی یہ تشریح کی ہے: ''غلط العام میں تراکیب غلط ہیں مگر کثرت استعمال اور قبولیت عامہ نے ان کو گوارا بنا دیا ہے یعنی ہیں تو غلط مگر اہل زبان عوام و خواص سب نے انھیں قبول کرلیا ہے۔ اس لیے یہ جائز ہی نہیں بلکہ فصیح بن گئے ہیں۔ اس اصطلاح کو عوام و جہلا کے ساتھ ساتھ خواص اور ثقات نے بھی قبول کرلیا ہو۔ ایسا لفظ فصیح سمجھا جائے گا''۔ (سرہندی، ۱۹۸۹ء، ص ۹۲) ''غلط العوام سے مراد جہلا کا طبقہ ہے جس میں اہل علم اور ثقات شامل نہیں۔ اس لیے ایسے الفاظ جنھیں صرف جہلا استعمال کرتے ہیں اور اہل علم و ثقات ان سے احتراز کرتے ہیں ان کا استعمال جائز نہیں۔ مثلاً مسجد کا بگاڑ ''مسیت'' اور ''لب سڑک'' عوام میں مستعمل ہے اور ایسے الفاظ و تراکیب کا استعمال مذموم ہے''۔ (سرہندی، ۱۹۸۹ء، ص ۸۳) اور نتیجتاً مرحوم سرہندی نے ان دونوں کا فرق یوں واضح کیا ہے ''غلط العام فصیح ہے تو غلط العوام قبیح ہے''۔ (ایضاً) مثلاً:

متلاشی: تلاش کرنے والے کے معنی میں عربی اور ترکی لفظ کی حیثیت سے شامل ہے۔ اس صورت اور ان معنی میں یہ نہ عربی ہے نہ ترکی۔ یہ اردو والوں کا وضع کردہ ہے جو ترکی ''تلاش'' سے عربی اور اسم فاعل کے قاعدے پر بنا لیا گیا ہے۔ بہرحال اسے اردو کہہ سکتے ہیں۔ اگرچہ اردو میں بھی ثقہ حضرات اس کے استعمال کو پسند نہیں کرتے اور اسے غلط العوام سمجھتے ہیں۔ غلط یا صحیح

بہرصورت یہ اردو زبان کا حصہ ہے اور اسے اردو لفظ کے طور پر شامل کرنا چاہیے۔ عربی ''متلاشی'' کے معنی مضمحل ہیں اور ''تلاشی'' کے اضمحلال۔ (سرہندی، ۱۹۸۶ء، ج ۲، ص ۲۵۱)

مخلصی: mukhlisi چھٹکارا کے معنی میں مرقوم ہے اور مخلص mukhlis بمعنی دوست و بے ریا کے تحت درج ہے۔ اس لحاظ سے اس کے معنی دوستی ہونے چاہئیں۔ چھٹکارا کے معنی اردو میں یہ لفظ mukhlasi استعمال ہوتا ہے۔ یہ اردو والوں کا ساختہ پرداختہ ہے اور غلط العوام ہے۔ (سرہندی، ۱۹۸۶ء، ج ۲، ص ۲۵۴)

اردو میں کچھ ایسے الفاظ ملتے ہیں جن کا تلفظ معیاری زبان سے الگ رہتا ہے انہیں بھی عامیانہ تلفظ کہا جاتا ہے۔ مثلاً:

اکسیر: اس کا صحیح اور معیاری تلفظ iksir ہے بہ فتح اول aksir اس کا عامیانہ تلفظ۔ (سرہندی، ۱۹۸۶ء، ج ۲، ص ۵۱)

اَمَن: غلط ہے، عامیانہ یا جہلا کی زبان کہا جا سکتا ہے۔ صحیح تلفظ amn ہے۔ (ایضاً، ص ۵۶)

تالیقہ: عربی کا ''تعلیقہ'' بگاڑ کر ''تالیقہ'' عوامی لہجہ ہے۔ (سرہندی، ۱۹۸۷ء، ج ۳، ص ۸۵)

دیوال: یہ بھی عامیانہ لفظ ہے۔ خواندہ لوگ ''دیوار'' ہی استعمال کرتے ہیں۔ (ایضاً، ص ۱۵۳)

سابوت: اسے عربی لفظ کی حیثیت سے درج کرنے کے بعد ''ثبوت'' کا بگاڑ قرار دیا گیا ہے اور اس کے معنی: whole , entire (کل، تمام) بتائے ہیں۔ اس بگڑی ہوئی صورت میں اس کا عربی لفظ کے طور پر اندراج کسی طرح بھی درست نہیں۔ چونکہ اس کا استعمال صرف اردو تک اور وہ بھی جہلا تک محدود ہے۔ (ایضاً، ص ۱۶۷)

سنجاف: صحیح لفظ ''سجاف'' بالکسر نون ہے۔ یہ عربی لفظ ہے۔ فارسی میں بھی نون ہی مستعمل ہے۔ البتہ عوام ''سنجاف'' بولتے ہیں جو غلط ہے۔ یعنی ''سنجاف'' غیر معیاری اور عامیانہ تلفظ ہے۔ (ایضاً، ص ۱۷۸)

شَش : چھ کے معنی ۔اردو کی قریباً سبھی کتب لغت میں ''شش'' بالفتح ہی مندرج ہے اور عام بول چال میں بھی شین منقوطہ سے مستعمل ہے۔(ایضاً،ص ۱۸۸)

مَلہم : اردو میں جہلا کو''مرہم'' کی جگہ''ملہم'' بلکہ''مَلّم''(mallam)بولتے سنا ہے۔ (ایضاً،ص ۳۲۶)

موتاذ: اسے عربی کے طور پر درج کرنے کے بعد''معتاذ'' کا بگاڑ کہا ہے۔''موتاذ'' کا عربی سے کیا تعلق۔ جہلا''معتاذ'' کا تلفظ''موتاذ'' کریں تو الگ بات ہے۔(سرہندی،۱۹۸۷ء، ج ۳،ص ۳۲۸)

کچھ مزید ایسے الفاظ بھی ملتے ہیں جن کا املا معیاری زبان سے الگ رہتا ہے انہیں بھی عامیانہ بولا جاتا ہے۔مثلاً:

اژدہام: عربی لفظ کے طور پر مندرج ہے۔ یہ غلط املا ہے۔عربی میں اس کا صحیح املا ''ازدحام'' ہے۔اردو میں بعض لوگ البتہ بے خبری کے سبب''اژدہام'' کہتے ہیں جو سند نہیں ۔ اگر اسے اردو کے غلط العوام املا کے طور پر قبول کرلیا جائے تو بھی اسے عربی تو کسی صورت میں بھی نہیں کہا جاسکتا ہے۔(سرہندی،۱۹۸۷ء، ج ۳،ص ۳۵۵)

ملاحظہ کیا گیا کہ جہاں معیاری الفاظ سے ہٹ کر بات ہوتی ہے تو ان کے بولنے والوں کو''جہلا'' کے نام سے خطاب کیا جاتا ہے۔

مذکورہ اسالیب زبان (معیاری، غیررسمی اور غیر معیاری) کے بارے میں اکثر لوگوں کی کچھ مخصوص ذہنیت ہے جس کا پس منظر لسانی نہیں بلکہ معاشرتی ہے اور اسی پس منظر کی بنا پر وہ ایک اسلوب کو دوسرے اسلوب پر فوقیت دیتے ہیں۔بات دراصل یہ ہے کہ بول چال کی زبان، زندہ زبان کہلاتی ہے۔اس کا تعلق،شرحِ خواندگی سے نہیں ہوتا۔اس کے بولنے والے کسی بھی تہذیبی،علمی اور ادبی رجحان کے علم بردار ہو سکتے ہیں۔موقع ومحل کے حساب سے رسمی زبان بولنا مناسب نہیں سمجھا جاتا اور اس کے برعکس۔''ہر دور میں معاشرے کے لوگ (خواہ اعلیٰ خواہ متوسط طبقے) اپنی نئی ضرورتوں کی بنا پر، روزمرہ زندگی کے ہر شعبے میں (تجارت،فنون وغیرہ) الفاظ و عبارات کا انکشاف کر دیتے ہیں ۔ یہ ضرورتیں یا خواہشیں: تفریح،شوخی،چھیڑنے یا حقیقی و

بالواسطہ جذبات کا اظہار کرنے کے مطابق ہوسکتی ہیں''۔ (پیٹرز،۲۰۰۴ء، ص ۵۰۲)

غیر رسمی زبان وہ زبان ہے جو حلقۂ احباب، بے تکلف اور غیر سرکاری ماحول میں بولی جاتی ہے جب کہ رسمی زبان، سنجیدہ اور ریاستی ماحول میں۔ کچھ موقعوں میں کچھ الفاظ اپنانا، مناسب لگتا ہے اور کچھ موقعوں پر وہی الفاظ نامناسب۔ اس سلسلے میں اہم بات یہ ہے کہ ان دونوں میں سے مناسب الفاظ، مقتضائے کلام کے لیے انتخاب، بصیرت اور موقع شناسی کی علامت ہے۔ ''ایک عبارت کی انشا میں لفظوں کے معنی، نفس معنی، محل استعمال وغیرہ کی جانچ اور پڑتال لابُد ہے ورنہ کلام غیر فصیح، مبہم یا مبتذل ہوجائے گا''۔ (کیفی، ۱۹۴۲ء، ص ۹۸)

۱:۶- گذشتہ صفحات میں اس بات پر بحث ہوئی کہ ہم ''معیاری زبان'' کو ''غیر معیاری'' زبان سے صحیح تر، شائستہ تر اور بہتر سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ''معیاری زبان'' کو معاشرے کے اعلیٰ اور مہذب گروہ سے متعلق زبان شمار کرتے ہیں۔ جب کہ اس بات کا کوئی لسانی جواز نہیں ملتا ہے۔ جب لسانی نقطۂ نظر سے ہم کہتے ہیں کہ فلاں لفظ ''معیاری زبان'' سے تعلق رکھتا ہے اور فلاں لفظ ''غیر معیاری زبان'' ہے تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ دوسرا اسلوب، ''درست'' یا ''شائستہ'' نہیں ہے۔ ''معیاری زبان، شائستہ زبان نہیں بلکہ پاسبان زبان ہے''۔ (حقی، اکتوبر ۲۰۰۰ء، زبان کے معیار کا مسئلہ، اخبار اردو، ص ۵) نیز لسانیات میں یہ بحث نہیں ہے کہ پہلے اسلوب میں ''برتری'' (superiority) ہے اور دوسرے میں ''کم تری'' (inferiorrity)۔ ''غیر معیاری'' اسلوب سے مراد یہ ہے کہ وہ معیار یعنی طے شدہ اور مقررہ پیمانے اور درجے کا پیرو نہیں۔ چنانچہ یہ بحث چھیڑی کہ معاشرے کے مختلف طبقات کے سلینگ یعنی غیر معیاری سے مراد گرا ہوا یا نچلا اسلوب (sub-standard) نہیں ہے۔

اس سلسلے میں مولانا شبلی نعمانیؒ نے (۱۸۵۷-۱۹۱۴ء) اور مرحوم سرہندی نے ایک اہم رائے دی۔ انہوں نے ''روزمرہ'' کی تعریف میں لکھا ہے کہ: ''جو الفاظ اور خاص ترکیبیں اہل زبان کی بول چال میں زیادہ مستعمل اور متداول ہوتے ہیں ان کو روزمرہ کہتے ہیں'' (شبلی نعمانی، ۱۹۲۸ء، ص ۴۶)/ (سرہندی، ۱۹۸۹ء، ص ۸۳) اور دونوں نے روزمرہ کو فصاحت کا جزو قرار دیا ہے۔ ''روزمرہ اگرچہ ایک جداگانہ وصف سمجھا جاتا ہے لیکن درحقیقت وہ فصاحت ہی کا ایک جزو خاص

ہے۔اور اگر عام بول چال میں کچھ ثقل و گرانی ناموزوں ہوتو رات دن کی بول چال اور کثرت استعمال سے وہ منجھ کر صاف ہو جاتے ہیں''۔(شبلی نعمانی ،ایضاً) ''روزمرہ،فصاحت کی جان ہے''۔(سرہندی،ایضاً) چنانچہ کوئی اسلوب، دوسرے اسلوب پر فائق نہیں ہوتا ہے۔

۶:۲-جس نکتے کو ہم ''معیاری'' کہتے ہیں ایک ایسا نکتہ ہے جس کا تعلق پرسٹیج (prestige) سے ہوتا ہے۔یعنی کسی گروہ میں اپنے آپ کو مقبول یا پرتاثیر بنانا۔اور پرسٹیج ایک ایسا معاشرتی فیکٹر ہے جس کا تعلق لسانیات سے بالکل نہیں۔بات یہ ہے کہ ہر زبانی اسلوب، اپنی اپنی جگہ پر درست استعمال ہوتا ہے۔انسانی گروہ اپنے پیشے، تربیت، ماحول اور مذاق کے لحاظ سے کسی قدر مختلف لسانی رجحانات رکھتے ہیں۔نہ صرف انتخاب الفاظ، بلکہ فوق قطع (suprasegmentals)،لحن (intonation)،تان (tone)،ارتکاز (stress) اور سُر (pitch) بولنے والے کا انداز بیان معیاری، غیر رسمی یا غیر معیاری کر سکتے ہیں۔حساس کان نہ صرف مقامی لہجے اور محاورے کو پہچان جاتے ہیں بلکہ مختلف پیشوں، حرفوں، طبقوں، محلوں اور گھرانوں تک کی زبان کو بھی تاڑ لیتے ہیں۔چنانچہ ''زبان کا ہر نمونہ، ندرت کا نمونہ بھی ہے۔عامیانہ زبان، آدمی ہی کی زبان ہے۔عامیانہ کا تصور، انسان ساختہ تصور ہے''۔(قاموس الفصاحت،۱۹۷۳ء،ص ۲۸۵)

۶:۳-عموماً اعلیٰ طبقے (یعنی تعلیم یافتہ اور بڑا عہدہ دار) کی زبان، مستند سمجھی جاتی ہے۔ مثلاً گذشتہ دور میں دربار ہی ثقافت کا مرکز ہوتا تھا اور یہیں کی زبان کو فصیح (بلکہ افصح) مانا جاتا تھا اور عوام کی زبان غیر فصیح کہلانے کی بنا پر نظر انداز کر دی جاتی تھی۔اسی تصور کی بنا پر لغات میں غیر رسمی اسلوب سے تعلق رکھنے والے الفاظ درج نہیں کیے جاتے تھے اور اگر شامل کیے بھی جاتے تو بہت ہی کم۔چنانچہ اس دور کے اچھے خاصے غیر رسمی الفاظ لغت میں شامل ہونے سے رہ گئے اور جو بچے رہ گئے ان کے تلفظ، املا اور مفہوم کے بارے میں ہماری معلومات ناکافی ہیں اور نتیجتاً اس دور کے متون کو سمجھنے میں دور حاضر میں دقت کا سامنا پڑتا ہے۔

نتیجہ: موجودہ علم لسانیات کے مطالعے سے یہ اہم نکتہ معلوم ہوتا ہے کہ زبان کا کوئی اسلوب، دوسرے اسلوب سے نہ برتر ہے، نہ شائستہ تر اور نہ پاکیزہ تر۔بولنے والا مقتضائے کلام کی بنا پر (یعنی: زماں، مکاں اور مخاطب کا لحاظ کرنا) اپنا کوئی مناسب اسلوب اپناتا ہے۔

اردو میں اسالیب زبان کے گذشتہ اور موجودہ دور کے تصور کا موازنہ۔

	فصیح	غیر فصیح
گذشتہ دور	(= درباری، ادبی، مہذب لوگوں کی زبان)	عوامی (= جاہلانہ، ان پڑھ لوگوں کی زبان) بازاری (= سوقیانہ، اوباش لوگوں کی زبان) گنواری (= دیہات، اجڈ کی زبان)

	معیاری	غیر رسمی	غیر معیاری
موجودہ دور	(= تعلیمی زبان)	(= روزمرہ کی زبان)	(= سلینگ، ٹیبو اور خفیہ گروہوں کی زبان)

پی نوشت

(۱) ڈاکٹر شمس الرحمٰن فاروقی کی کتاب کا پورا نام یہ ہے: ''لغات روزمرہ۔ اردو میں زبان کے غیر معیاری استعمالات کی فہرست کی تنقید''۔ یہ کتاب پہلی بار فروری ۲۰۰۳ء میں نئی دہلی سے چھپ گئی۔ اس کے بعد جولائی ۲۰۰۳ء میں اس کی اولین اشاعت پاکستان (کراچی) سے ہوئی۔ (۲) ''نکات سخن'' میں یہ مباحث شامل ہیں: (۱) متروکات سخن (۲) معائب سخن (۳) محاسن سخن (۴) نوادر سخن (۵) اصلاح سخن۔ ''غلط العوام و متروک الکلام'' میں یہ مباحث شامل ہیں: حصہ اول: صحت الفاظ (ان متعارف الفاظ کی صحت جن کے اعراب غلط مشہور ہیں)۔ حصہ دوم میں چھ قسمیں ہیں: (۱) وہ محاورات جو آتش و ناسخ سے پہلے متروک ہوئے (۲) وہ محاورات جو، ان کے زمانے میں متروک ہوئے (۳) وہ محاورات جو، ان کے بعد متروک ہوئے (۴) وہ الفاظ جو بعض کے نزدیک قابل ترک اور بعض کے نزدیک ناقابل ترک ہیں (۵) وہ قدیم محاورات جو تھوڑی ترمیم کے ساتھ رائج ہیں (۶) الفاظ فصیح و غیر فصیح کی تشریح اور آخر میں الفاظ مبتذل و مذموم کی تصریح۔

(۳) ''غلط ننویسیم۔ فرہنگ دشواری ہای زبان فارسی'' کی چودھویں اشاعت، ۲۰۰۹ء۔ (۴) اس حوالے سے فارسی اور اردو میں بیش بہا معلومات ''فصاحت و بلاغت'' کی کتابوں میں ملتی ہے۔ فارسی میں بعض معروف کتابیں: ''ترجمان البلاغۃ'' (محمد بن عمر رادویانی، پانچویں ہجری/گیارہویں عیسوی)/ ''حدائق السحر فی دقائق الشعر'' (رشید الدین محمد عمری کاتب بلخی المعروف بہ وطواط، چھٹی ہجری/بارھویں عیسوی)/ ''المعجم فی معاییر اشعار العجم'' (شمس الدین محمد بن قیس رازی، ساتویں ہجری/تیرھویں عیسوی)/ ''بلاغت تصویر'' (محمود فتوحی رود معجنی ۲۰۰۸ء)۔ اردو میں بعض کتابیں: ''نہر الفصاحت'' (محمد حسن قتیل، ۱۸۷۴ء)/ ''حدائق البلاغت'' (شمس الدین، ۱۸۸۷ء)، ''بحر الفصاحت'' (حکیم محمد نجم الغنی خاں زید نجمی رام پوری، ۱۹۱۷ء)، ''عین الفصاحت فی حدائق البلاغت'' (برکت علی، ۱۹۱۹ء)/ ''دستور الفصاحت'' (حکیم سید احمد علی خان یکتا لکھنوی، ۱۹۴۳ء)۔ (۵) انگریزی

لسانیات میں ''تعظیمی زبان'' (deferential language) کے لیے کوئی علاحدہ زبانی اسلوب نہیں قرار دیا جاتا ہے۔ جب کہ اردو یا فارسی زبان میں با قاعدہ اسلوب زبان ہے۔ جب ہم اپنے اعلیٰ رتبہ مخاطب کے ساتھ تعظیمانہ اور انکسارانہ انداز میں گفتگو کرتے ہیں۔(۶) ''sub-standard'' کا اردو ترجمہ: ''غیر معیاری، گھٹیا، کم تر'' (انگریزی۔اردو لغت، ۱۹۹۷ء، ج ۵، ص ۹۲۹) ر''معیار سے گرا ہوا، گھٹیا، ادنیٰ۔(زبان) فصاحت کے درجے سے کم تر۔'' (آکسفورڈ انگلش۔اردو ڈکشنری، ۲۰۰۳ء، ص ۱۶۳۸) ''وبسٹر ز تھرڈ نیو انٹرنیشنل ڈکشنری'' (اشاعت ۱۹۸۱ء) میں ''non-standard'' اور ''sub-standard'' دونوں کا فرق یوں بیان کیا ہے: ''substandard ایک ایسا اسلوب ہے کہ بولنے والوں کی زبان پر جاری ہے تاہم کسی پرسٹیج گروہ میں الفاظ و عبارات کے انتخاب میں ملحوظ فرق کی نشاندہی کرتا ہے۔ nonstandard ایک ایسا اسلوب ہے جو کچھ ایسے محدود الفاظ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جنھیں مشکل سے اسٹیٹس لیبل (status label) قرار نہیں دیا جا سکتا۔ تاہم ان الفاظ کو، اپنی وسیع استعمال کی بنا پر substandard نہیں کہا جا سکتا ہے۔'' چنانچہ اس ڈکشنری نے ۱۹۸۱ء میں یہ فیصلہ کن بات کی: ''nonstandard'' ایک ایسا اسلوب ہے جو ''standard'' اور ''substandard'' کے درمیان ہوتا ہے۔ ''وبسٹر ز ایٹھنیو کولیگیٹ'' (اشاعت ۱۹۷۹ء) اور ''وبسٹر ز نائنتھ نیو کولیگیٹ'' (اشاعت ۱۹۹۱ء) میں non-standard اور sub-standard کی تشریح یوں بدل گئی ''substandard ایسے الفاظ و عبارات کے لیے استعمال کیا جاتا ہے اور وسیع پیمانے پر اس کی پیروی کی جاتی ہے تاہم کسی پرسٹیج گروہ میں الفاظ و عبارات کے انتخاب میں ملحوظ فرق کی نشان دہی کرتا ہے۔ nonstandard ایسے محدود الفاظ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جو بہت سے لوگوں کے ہاں ناپسندیدہ شمار کیا جاتا ہے تاہم اپنی رواج کی بنا پر منظور شدہ ہے۔'' ۱۹۹۴ء میں ''وبسٹر ز تینتھ کولیگیٹ'' نے بھی ان دو اسالیب کا یہی فرق وضاحت کی ہے۔ یہ معلومات اس ویب سائیٹ سے اخذ کی گئی ہیں:

(www.oocities.org/gearcy1031/.../NonstandardVSubstandard.htm)

(۷) انگریزی۔اردو لغت میں سوقیانہ زبان (vulgar language) کی تشریح میں لکھا ہے: (۱) عامیانہ، بازاری، معمولی (۲) بے ہودہ، اوچھا، بھدا، سفلہ، کمینہ، ذلیل، غیر شائستہ (۳) عامیانہ، عوام کا (۴) نیچی ذات کا، عامی، معمولی شخص'' (۱۹۹۷ء، ج ۶، ص ۷۲۵) ان سوقیانہ الفاظ و عبارات کا، ادبی اور رسمی طریقۂ اظہار سے (خواہ تقریر یا تحریر میں) شدیداً اجتناب کیا جاتا ہے۔

(۸) معیاری زبان کی مثال: ''پیٹرول پمپ'': (استہزائیہ) بہت موٹا اور بھدا شخص جو آسانی یا تیزی سے نہ چل سکے (اولین اردو سلینگ لغت، ۲۰۰۶ء، ص ۷۲)۔ دیگر زبان کی مثال: ''رٹہ فیکیشن'': کتاب یا نصابی مواد کو

سمجھے بہ غیر رٹنا (رٹہ: اردو لفظ fication انگریزی) (ایضاً، ص ۱۴۳)۔ متروک الفاظ کی مثال: ''پتی'': جزو، حصہ، شراکت کا حصہ (خاص طور پر پیسوں یا کسی کھانے پینے کی چیز میں) (ایضاً، ص ۶۰) (سنسکرت: ''پتی'' بمعنی: حصہ)۔ (۹) فارسی میں ''سلینگ'' کو ''عامیانہ'' کہتے ہیں۔ اس حوالے سے معروف فارسی لغت کا عنوان یہ ہے: ''فرہنگِ فارسیِ عامیانہ'' (ابوالحسن نجفی، طبعِ اول، ۱۹۹۹ء)۔ نقشے کے فارسی سلینگ کے ترجمے: آدَمِ سِہ پیچ: روڑ لٹکانے والا/ آمارِ کسی راداشتَن: کسی کے بارے میں تمام معلومات جاننا/ اِدِ چیزی بودَن: کسی کام میں استاد ہونا/ تیزی: ہر کوئی تیز کاٹنے والی چیز جیسے: چوری/ تیغ زَدَن: دھوکے بازی سے کسی سے پیسے لینا۔ (۱۰) یہ مثالیں ایرک ہانی ووڈ پیٹر یج (۱۸۹۴ـ۱۹۷۹ء) کی کتاب: ''سلینگ ٹوڈے اینڈ یس ٹرڈے'' (۱۹۳۳ء، ص ۲۸۶) اخذ کی گئی ہیں۔ (۱۱) راقم الحروف کے تجزیے کے مطابق ''جارگوں'' کی دو قسمیں ہوتی ہیں: ایک اکیڈیمک جارگوں (جیسے: ابلاغیات، ریاضیات، کمپوٹر وغیرہ کی) اور دوسرا پیشہ ورانہ جارگوں (جیسے: درزیوں، دکان داروں، موچیوں وغیرہ کی)۔ (۱۲) ''بازاری زبان واصطلاحات پیشہ وران'' میں یہ تین اسالیب زبان کا تعارف دیا گیا ہے: قسم اول: بازاری زبان۔ قسم دوم: محاورات عامیانہ (بازاریوں کی زبان پر بیش تر، ثقات کی زبان پر کم تر)۔ قسم سوم: خاص مصطلحات (نشہ بازان، پیشہ وران وغیرہ) افیوں، بُزقصابوں، بیرٹوں، پالیبوں، پہلوانوں، جواریوں، چرسیوں، دلالوں، زنانوں، سپاہیوں، سیف بازوں، شُہدوں، فقیروں، فیل بانوں، قصائیوں، کمہاروں اور موچیوں کی اصطلاحیں۔ (۱۳) جس قدر الفاظ جمع کیے گئے مرتب نے پیشہ وروں کے پاس بیٹھ کر اور سن کر بڑی کوشش اور غور سے سمجھے اور معلوم کیے ہیں۔ ان آٹھ جلدوں میں ڈیڑھ سو پیشوں کی تقریباً پندرہ ہزار اصطلاحات، تشریحات کے ساتھ مرتب ہوئیں۔ اس ذخیرہ میں: معماری، تعمیر و آرایش، لباس، ظروف سازی، خوراک، پکوان، زیورسازی، بناؤ سنگھار، فنون لطیفہ، نقاشی، کتابت وطباعت، سواری، بار برداری، کشتی رانی، کاشت کاری، باغ بانی، آب پاشی، لوہے، دھات، لکڑی کے مختلف کام، طبی، میکانکی سے لے کر مشاغل، کھیل، شعبدہ بازی تک کے مختلف پیشوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس فرہنگ کی مختلف جلدوں کی مختلف اشاعتیں: جلد اول: (طبع اول: ۱۹۳۹ء، انجمن پریس، کراچی) (طبع دوم: ۱۹۷۵ء، انجمن ترقی اردو، کراچی) / جلد دوم: (طبع اول: ۱۹۴۰ء، انجمن پریس، کراچی) (طبع دوم: ۱۹۷۶ء، انجمن ترقی اردو، کراچی) / جلد سوم: (طبع اول: ۱۹۴۰ء، انجمن پریس، کراچی) (طبع دوم: ۱۹۷۷ء، انجمن ترقی اردو، کراچی) / جلد چہارم: (طبع اول: ۱۹۴۱ء، انجمن پریس، کراچی) (طبع دوم: ۱۹۷۸ء، انجمن ترقی اردو، کراچی) / جلد پنجم: (طبع اول: ۱۹۴۱ء، دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی) (طبع دوم: ۸۰ـ۱۹۷۹ء، انجمن ترقی اردو، دہلی) / جلد ششم: (طبع اول: ۱۹۴۲ء، محبوب المطابع پریس، دہلی۔ انجمن ترقی اردو، دہلی) / جلد ہفتم: (طبع اول:

۱۹۴۳ء، مفید عام پریس، لاہور۔ انجمن ترقی اردو، دہلی) رجلد ہشتم: (طبع اول: ۱۹۴۴ء، دیال پرنٹنگ پریس، لاہور۔ انجمن ترقی اردو، دہلی)

(۱۴) راقم الحروف کی نظر میں ''آرگو'' اور ''کینٹ'' کو ''ٹھگوں کی زبان'' کہہ سکتے ہیں جس سے جرائم پیشگی معلوم ہوتا ہے۔

۱-فہرست اسناد محولہ:

اردو اور فارسی

پاریکھ، رؤف، (۲۰۰۶ء)، ''اولین اردو سلینگ لغت''، فضلی سنز، کراچی۔

پرچمی، محبّ اللہ، (۲۰۱۰ء)، ''فرہنگ شفاہی سخن''، سخن، تہران۔

حقی، شان الحق، (۲۰۰۰ء)، ''زبان کے معیار کا مسئلہ''، اخبار اردو، شمارہ ۱۰، اکتوبر، اسلام آباد۔

سرہندی، وارث، (۱۹۸۶ء)، ''کتب لغت کا تحقیقی ولسانی جائزہ''، مقتدرہ قومی زبان، جلد دوم، اسلام آباد۔

سرہندی، وارث، (۱۹۸۹ء)، ''زبان و بیان (لسانی مقالات)''، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد۔

شبلی نعمانی، مولانا، (۱۹۳۶ء)، ''موازنہ انیس و دبیر''، لالہ رام نرائن لعل، طبع اول، الہ آباد۔

صدیقی، ابوالاعجاز حفیظ، (۱۹۸۵ء)، ''کشاف تنقیدی اصطلاحات''، نظر ثانی: احمد خاں، آفتاب، مقتدرہ قومی زبان، طبع دوم، اسلام آباد۔

عبدالحق، مولوی، (۱۹۷۳ء)، ''لغت کبیرِ اردو'' جلد اول، انجمن ترقی اردو، کراچی۔

فاروقی، شمس الرحمٰن، (۲۰۰۳ء)، ''لغات روزمرہ''، آج کی کتابیں، طبع دوم، کراچی۔

کیفی، پنڈت برج موہن دتاتریہ، (۱۹۴۲ء)، ''کیفیہ۔ اردو زبان کی مختصر تاریخ اور اس کی انشا اور املا وغیرہ کے متعلق ہر قسم کے ضروری اور اہم امور سے بحث'' انجمن ترقی اردو، طبع اول، دہلی۔

مخمور اکبرآبادی، سید محمد محمود رضوی، (۱۹۷۳ء)، ''قاموس الفصاحت یعنی اردو زبان کی کہاوتوں، محاوروں، روزمروں کا گنجینہ''، انجمن اسلامی پاکستان، کراچی۔

۲-انگلش:

Ahmad, Kalimuddin, (1997), "English-Urdu Dictionary", National Council for Promotion of Urdu Language, Fifth & Sixth Volumes, New Delhi.

Ali Khan, Aamir, (2010), "Dictionary of Linguistic Terms English-Urdu", National Language Authority, Islamabad.

Burchfield,R.W, (Third Revised edition:2004), "Fowler's Modern English

Usage", Oxford University Press, Oxford.

Crystal, David, (1992), "An Encyclopedic of language and languages", Blackwell, Uk.

Crystal, David, (2001), "The Cambridge Encyclopedia of the English Language", Cambridge University Press, Cambridge.

Fowler, H.W, (1926), "A Dictionary of Modern English Usage", First edition with an introduction by: Simon Winchester, Reissued in new covers, (2002).

Haqqee, Shanul Haq, (2003), "The Oxford English-Urdu Dictionary", Oxford University Press, First edition, Karachi.

Hartmann, R.R.K- James, Gregory, (1998), "A Dictionary of Lexicography", Routledge,London & New York.

Jalibi, Jameel, (1992), "Qumi English- Urdu Dictionary", Muqtadira Qumi Zuban, First edition, Islamabad.

Partridge, Eric Honey wood, (1933), "Slang: Today and Yesterday-with a short historical sketch and vocabularies of English and Australian slang", Macmillan Company, New York. Introduction by: Simon Winchester, Reissued in new covers, (2002).

Peters, Pam, (2004), "The Cambridge Guide to English Usage", Cambridge University Press, Cambridge.

(Compiled and Translated)Reebuk, Thomas, (1824), "A Collection of Proverbs and Proverbial Pharases in the Persian and Hindoostaniee Languages- The present publication is inscribed to G.B.Gilchrist", Hindoostani Press, Calcutta.

"The Chambers Dictionary", (Reprint: 2007),Chambers Harrap Publishers, Tenth edition, Edinburg.

"The Oxford dictionary of Synonyms and Antonyms", (2007), Oxford University Press, second edition, London.

"The Random House Dictionary of the English Language", (1983), Unabridged edition, New York.

"The Random House Dictionary of the English Language",(1987), Second Unabridged edition, New York.

www.oocities.org/gearcy1031/.../NonstandardVSubstandard.ht.

جہان شبلی

ڈاکٹر شمس بدایونی

''جہان شبلی'' کا یہ عنوان قاضی عبدالودود کے اختیار کردہ عنوان ''جہان غالب'' کی طرز پر دسمبر ۲۰۱۲ء میں قائم کیا گیا تھا۔جس کے تحت اب تک چھ قسطیں ، ہماری زبان دہلی ، معارف اعظم گڑھ، آجکل اور ایوان اردو دہلی وغیرہ میں شائع ہوچکی ہیں ۔ یہ علامہ شبلی نعمانی اور ان کے متعلقات پر منتشر ریزہ ریزہ معلومات و حقائق کی جمع آوری کا ایک منصوبہ بند سلسلہ ہے جو یکجا ہوجانے کے بعد شبلی پر خام مواد اور اضافی معلومات کی صورت میں کام آسکتا ہے۔ان قسطوں کو پیش کرنے کا اصلاً جواز یہی ہے۔

وہ معلومات و اطلاعات جو شبلی اور موضوع شبلی سے غیر متعلق کتب و مضامین میں ملتی ہیں مگر مختصر و محدود ہیں اور جو کسی مستقل مضمون کی بنیاد بھی نہیں بن سکتیں ، فی الواقع اہم اور مفید مطلب ہیں،تو ایسی تمام تحریروں ،عبارتوں اور اقتباسات کو خواہ وہ سطر دو سطر پر ہی مشتمل کیوں نہ ہوں اس عنوان کے تحت جمع کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔

شبلی کی کتابوں و تحریروں اور شبلی پر لکھی جانے والی کتب اور مقالات سے متعلق بھی اگر کوئی نادر اطلاع ، اہم توضیح ، تصحیح یا تصریح کی صورت پیدا ہوئی تو اس کو بھی اس عنوان کے تحت شامل کرلیا گیا ہے۔ قارئین نے اس سلسلے کو پسند کیا ہے اور جاری رکھنے کی فرمائش بھی کی جاتی رہی ہے،اس لیے خاصے وقفے کے بعد ساتویں قسط حاضر خدمت ہے۔

(۱)

مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

۵۸، نیو آزاد پورم کالونی،عزت نگر، بریلی، یوپی،۲۴۳۱۲۲۔

۱۹/ مئی ۱۹۱۴ء کو جب منازعات ندوہ کے سلسلے میں دہلی کے بعض علماء نے ''علم الکلام'' اور ''الکلام'' کی بعض عبارتوں کی بنا پر جب ان (علامہ شبلی) کی تکفیر کا فتویٰ دیا تو صاف اعلان فرمایا: ''میرے عقائد وہی ہیں جو حضرات حنفیہ کے عقائد ہیں۔ میں عقائد اسلام اور مسائل فقہیہ دونوں میں حنفی ہوں''۔ (دیباچہ حیات شبلی، اول:۴۳)

حیات شبلی کے آخری اوراق میں سید صاحب نے ایک عنوان ''عقائد و خیالات'' قائم کرکے اس سلسلے کی مزید تفصیل دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''الکلام'' میں مولانا نے ملحدین کے بہت سے اعتراضات نقل کرکے ان کے جوابات دیے ہیں۔ بعض لوگوں نے دیدہ و دانستہ یا نادانستہ ان اعتراضات کو مولانا کے عقائد میں داخل کردیا۔ ۱۹۱۴ء میں معاملات ندوہ کی تحقیقات کے لیے دلی میں جو جلسہ ہوا، اس میں بعض مخالف علماء نے انھی عقائد کی بنا پر ان پر کفر کا فتویٰ لگایا اور ظاہر کیا کہ وہ مادے کو قدیم اور غیر مخلوق اور نبوت کو اکتسابی سمجھتے ہیں۔ اس پر سید عبدالسلام صاحب مرحوم مالک مطبع فاروقی دہلی نے مولانا سے اس کے متعلق سوال کیا، مولانا نے اس کا یہ جواب لکھا......۔

اس اعلان میں آخری سطریں یوں ہی چھپی ہوئی ہیں، مگر چونکہ میں اس واقعے کے وقت حاضر تھا، جیسا کہ میں نے پہلے بھی لکھا ہے اس لیے مجھے علم ہے کہ اصل میں پہلے جو کچھ مولانا نے لکھا تھا اس کی اخیر سطریں انھوں نے یہ لکھی تھیں جو ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی اب تک میرے پاس ہیں۔ ''باقی میرے عقائد وہی ہیں جو حضرات حنفیہ کے عقائد ہیں۔ میں عقائد اسلام اور مسائل فقہیہ دونوں میں حنفی ہوں۔ شبلی۔ ۹/ مئی ۱۹۱۴''۔ مگر چونکہ سید عبدالسلام صاحب اہل حدیث تھے اس لیے ان کی درخواست پر مولانا نے وہ الفاظ رکھے جو اعلان میں ہیں۔ یہ ان کی وفات سے صرف چھ مہینے پہلے کی تحریر ہے۔ (حیات شبلی:۸۲۳-۲۴)

سید صاحب نے حیات شبلی میں شبلی کے اعلان براءت کا عکس بھی دیا ہے۔

مذکورہ بالا بیانات میں دو باتیں تصحیح طلب ہیں: اول صفحہ نمبر ۴۳ پر فتویٰ تکفیر کی تاریخ ۱۹ر مئی کے بجائے ۹ر مئی ہونا چاہیے۔اغلباً یہ کتابت کی غلطی ہوگی۔ دوم دوسرے بیان میں ایک خط کے تخاطب و تسلیم کے الفاظ حذف کر کے اسے ''اعلان'' کی صورت میں نقل کرنا اور یہ بتانا کہ فتوی تکفیر سے براءت کے لیے یہ اعلان شائع کیا گیا تو صحیح بات یہ ہے کہ سید عبدالسلام مالک مطبع فاروقی دہلی نے ملک خصوصاً دہلی میں شبلی کے خلاف ماحول بنتے دیکھ کر ان کو خط لکھا اور مسئلہ زیر بحث پر ان کے موقف کی وضاحت چاہی۔سید عبدالسلام نے لکھا:

بحضرت مولانا شبلی صاحب۔السلام علیکم۔

مجھے آپ سے چند سوال پوچھنے ہیں، اجازت ہو تو عرض کروں۔

(۱) میں نے سنا ہے کہ آپ نے اپنی تصنیف ''الکلام'' میں مادہ عالم (کو) غیر مخلوق لکھا ہے۔کیا آپ کا یہ اعتقاد صحیح ہے؟ اور آپ نے تصنیف مذکور میں یہ مسئلہ اپنے مذہب کا لکھا ہے یا کیا؟

(۲) کیا آپ کا یہ عقیدہ ہے کہ آپ نبوت کو اکتسابی سمجھتے ہیں، یعنی کیا آپ یہ مانتے ہیں کہ ہر ایک آدمی اکتساب اور محنت سے نبی ہوسکتا ہے یا اس کی اصلیت کچھ اور ہے؟

(۳) اس کے علاوہ اور بھی کوئی خیال آپ نے ایسا ظاہر کیا ہے جس کی شہادت قرآن مجید اور صحیح احادیث سے نہ مل سکے۔آپ جو کچھ جواب دیں گے اسے میں پبلک میں شائع کروں گا۔

۴ر جمادی الآخر ۱۳۳۲ھ، عاجز سید عبدالسلام، مالک مطبع فاروقی، دہلی۔

پیش نظر خط ۴ر مئی ۱۹۱۴ء کو لکھا گیا تھا۔شبلی نے اس کا جواب دیا اور لکھا:

جناب میر صاحب۔وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ۔

جس کا یہ عقیدہ ہو کہ مادہ قدیم ہے اور خدا کا مخلوق نہیں ہے، وہ ملحد اور زندیق ہے۔میں مادے کو نہ قدیم بالذات تسلیم کرتا ہوں نہ قدیم بالزماں؛ البتہ میں یہ مانتا ہوں کہ خدا کے تمام اوصاف قدیم ہیں۔

''الکلام'' میں اگر اس قسم کے اقوال مذکور ہیں تو وہ غیر مذہب والوں کے عقائد ہیں اور اس غرض سے نقل کیے ہیں کہ ان کا رد کیا جائے۔

نبوت کے متعلق میرا ہرگز یہ اعتقاد نہیں ہے کہ وہ اکتسابی ہے اور ہر شخص نبی ہوسکتا ہے۔ میں نبوت کو عطیہ الٰہی سمجھتا ہوں اور آنحضرت ﷺ کو خاتم الانبیا یقین کرتا ہوں، اور جو شخص اس بات کا قائل ہو کہ آنحضرت ﷺ کے بعد بھی کوئی نبی ہوسکتا ہے، میں اس کو مسلمان نہیں جانتا۔

باقی میرے عقائد وہی ہیں جو قرآن شریف اور احادیث سے ثابت ہیں۔ میں عقیدۃً اور فقہاً دونوں لحاظ سے اہل سنت و جماعت ہوں۔ شبلی نعمانی

(مجموعہ نظم شبلی اردو: ۳۳)

شبلی کے خط پر تاریخ مرقوم نہیں لیکن سید صاحب نے دو جگہ ۹ر مئی ۱۹۱۴ء تاریخ لکھی ہے، اس لیے گمان گزرتا ہے کہ یہ خط ۹ر مئی ۱۹۱۴ء یا اس کے قریب ترین عرصے کا مکتوبہ ہے۔ سید صاحب کی عبارت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عبدالسلام فاروقی کو جواب لکھنے سے پیشتر وہ ڈیڑھ سطری اعلان بھی خود اپنے قلم سے لکھ کر بعض ارباب دہلی کو برائے اشاعت روانہ کر چکے تھے اور جو عبارت اعلان میں لکھی تھی (جس کا عکس حیات شبلی میں موجود ہے) اسی سے ملتی جلتی عبارت عبدالسلام کے خط میں بھی لکھی تا کہ اگر یہ خط شائع ہو تو متفنن لوگ اس سے کوئی نیا فتنہ نہ کھڑا کر سکیں۔ شبلی کا یہ اندیشہ صحیح ثابت ہوا دونوں خط سید ظہور الحسن موسوی کے اہتمام میں چھپنے والے ''مجموعہ نظم شبلی اردو مع سوانح عمری'' (مطبوعہ رنگین پریس، دہلی سنہ ندارد) کے صفحہ ۳۲ پر ''مولانا شبلی کے عقائد'' کے عنوان سے نقل ہوئے ہیں۔

راقم الحروف کے پیش نظر طبع اول ہے کسی بھی قرینے سے اس کے سال اشاعت کا علم نہیں ہوسکا۔ یہ مجموعہ شبلی کی وفات کے بعد شائع ہوا تھا۔ شبلی کی وفات سے متعلق دو مضامین، مصنفہ: عبدالحلیم شرر اور سید احمد دہلوی کے علاوہ ایک ماتمی نظم بھی اس میں شامل ہے اور نظم کی پشت پر مذکورہ بالا دونوں خط نقل کر دیے گئے ہیں۔ گمان ہے کہ یہ دسمبر ۱۹۱۴ء کے بعد شائع ہوا ہوگا۔ کیونکہ شرر کا مضمون ماہنامہ ''دلگداز'' لکھنؤ کے نومبر ۱۹۱۴ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا،

وہیں سے اخذ کر کے اس مجموعے میں بدون حوالہ شامل کرلیا گیا ہے۔جن لوگوں نے اس مجموعے کا سال اشاعت ۱۹۱۶ء لکھا ہے وہ درست نہیں۔

مذکورہ بالا اعلان براءت کی صحیح حقیقت سے مطلع ہوجانے کے بعد اسے شبلی کے ایک نو دریافت خط کے طور پر غیر مدون خطوط میں شامل کیا جانا چاہیے اور شبلی کے مکتوب الیہم کی فہرست میں سید عبدالسلام کے نام کا اضافہ بھی کر لینا چاہیے۔

(۲)

پروفیسر حنیف نقوی (ف ۲۰۱۲ء) نے اپنے ادبی سفر کے ابتدائی دور میں ''بعض اشعار کا غلط انتساب'' عنوان سے ایک سلسلہ مضامین شروع کیا تھا۔اس سلسلے کی پہلی قسط میں انہوں نے ۲۴/اشعار کے غلط انتساب پر گفتگو کی ہے اور ان کے اصل شاعر کے نام سے مطلع کیا ہے۔ موازنہ انیس و دبیر (اول ۱۹۰۷ء) میں شبلی کے درج کردہ بعض اشعار کی نسبت کی تغلیط کرتے ہوئے صحیح صورت حال سے باخبر کیا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

۱-بھلا تصرف بے جا سے ان میں کیا حاصل اٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو

اردو ادب میں ایک محقق کی حیثیت سے علامہ شبلی کا مرتبہ بہت بلند ہے،لیکن ''موازنہ انیس و دبیر'' میں علامہ موصوف نے اشعار نقل کرنے میں بعض جگہ بڑی غیر ذمہ داری سے کام لیا ہے۔چنانچہ مندرجہ بالا شعر انہوں نے دو جگہ انیس کے نام سے نقل کیا ہے لیکن اصل میں یہ انیس کا نہیں بلکہ مونس کا ہے۔اس زمین میں انیس،دبیر،مونس،اوج (فرزند دبیر) اور مشیر (شاگرد دبیر) سبھی نے طبع آزمائی کی ہے،مگر انیس کے اکثر اشعار اپنی فصاحت و لطافت اور حسن بیان کے باعث زبان زد خاص و عام ہیں۔غالباً اسی وجہ سے یہ شعر انہیں کا سمجھا جاتا رہا ہے۔اس قافیے میں انیس کا یہ شعر بہت مشہور ہے:

سدا ہے فکر بلندی ، بلند بینوں کو ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو

۲-ع زیر قدم والدہ فردوس بریں ہے۔''موازنہ'' میں میرزا دبیر کے کلام سے ثقل الفاظ کی مثال پیش کرتے ہوئے یہ مصرع نقل کیا گیا ہے،مگر مذکورہ مصرعہ دبیر کا نہیں،حکیم قدیر الدولہ قدیر لکھنوی کا ہے۔اصل مصرعے میں ''فردوس بریں'' کے بجائے ''فردوس علا'' نظم ہوا ہے۔

قدیر کے مرثیے کا وہ بند جس میں یہ مصرعہ واقع ہے، ہدیہ ناظرین ہے:

امّاں کی اطاعت نہ کروں میں، تو خطا ہے — زیر قدم والدہ فردوس علا ہے
زینب کا ادب والدہ صاحب سے سوا ہے — بیٹا مجھے اپنا پھوپھی امّاں نے کیا ہے
تو جانتا ہے مجھ پہ جو احسان کیے ہیں
پالا بھی ہے اور بیٹے بھی قربان کیے ہیں

۳- جو روضے میں باریاب ہوجاتا ہے
وہ کام میں کامیاب ہوجاتا ہے
جلتا ہے جو شب کو قبر حیدر پہ چراغ
وہ صبح کو آفتاب ہوجاتا ہے

علامہ شبلی نے یہ رباعی میر انیس کی رباعیات میں شامل کرلی ہے، لیکن افضل علی ضَو بدایونی صاحب ''ردالموازنہ'' کے بیان سے پتا چلتا ہے کہ میرزا دبیر کی تخلیق ہے۔ اسی ردیف و قافیہ میں میرزا صاحب کے کلام میں دو رباعیاں اور بھی ملتی ہیں۔ زیر بحث رباعی کا مصرعہ ثانی اصل میں اس طرح ہے:

وہ اوج میں لاجواب ہوجاتا ہے

۴- محبوب ہوں خدائے ذوی الاحترام کا — نانا ہوں میں حسین علیہ السلام کا
ع فرمایا میں حسین علیہ السلام ہوں۔

یہ شعر اور مصرع بھی میرزا دبیر کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے، مگر الحاقی ہے اور دبیر کے کلیات مراثی کے کسی مستند نسخے میں موجود نہیں۔ (ماہنامہ نیا دور لکھنؤ، اکتوبر ۱۹۵۸ء، ص: ۲۱-۲۲)

(۳)

پاکستانی ناقد ڈاکٹر سلیم اختر محتاج تعارف نہیں۔ ان کی ایک کتاب ''تنقیدی دبستان'' کا ہندوستانی ایڈیشن (پبلشر عاکف بک ڈپو، دہلی ۲۰۰۳ء) پیش نظر ہے۔ دیباچے پر تاریخ ۳۰ر نومبر ۱۹۷۳ء ہے۔ گویا پاکستانی ایڈیشن نومبر ۱۹۷۳ء کے بعد شائع ہوا ہوگا۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے تنقید کے بارہ دبستانوں کو متعارف کرایا ہے۔ اسی کی ایک صورت

''تقابلی تنقید'' بھی ہے۔ تقابلی تنقید کی گفتگو ہو اور آزاد و شبلی کا ذکر نہ ہو یہ ممکن نہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

اردو میں تقابلی تنقید کی سب سے مشہور مگر بدنما مثال شبلی کا ''موازنہ انیس و دبیر'' قرار دی جاسکتی ہے۔ شبلی بالغ نظر اور نکتہ سنج نقاد تھے لیکن ''موازنہ'' میں ان کی طبیعت کا جوشیلا پن انہیں لے ڈوبا۔ انہوں نے تمہید میں یوں لکھا ہے:

''میر انیس کا کلام شاعری کی تمام اصناف کا بہتر سے بہتر نمونہ ہے لیکن ان کی قدردانی کا طغرائے امتیاز صرف اس قدر ہے کہ وہ اور میرزا دبیر حریف مقابل قرار دیے گئے اور مدت ہائے دراز کی غور وفکر، کدوکاوش، بحث وتکرار کے بعد بھی فیصلہ نہ ہوسکا کہ ترجیح کا مسند نشین کس کو کیا جائے''۔ اور یوں تمام کتاب قوم کی ''بدمذاقی'' کے خلاف صدائے احتجاج اور دبیر کے مقابلے میں انہیں کو ''ترجیح کا مسند نشین'' کرانے کی کوشش بن گئی۔ (تنقیدی دبستان، ص:۱۳۴)

کیا ادب کا ایک سچا طالب علم ڈاکٹر سلیم اختر کی مذکورہ بالا رائے سے اتفاق کرسکتا ہے؟

(۴)

ماہنامہ جامعہ (دہلی) کے سابق مدیر عبداللطیف اعظمی (ف ۲۰۰۲ء) جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے تعلیم یافتہ تھے اور زندگی بھر اسی ادارے سے وابستہ رہے۔ غالباً ۱۹۴۱ء میں بی اے آنرز کے لیے انہیں ایک مقالہ لکھنا تھا۔ انہوں نے یہ مقالہ بہ عنوان ''مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں'' لکھا جو شبلی اکادمی دہلی نے ۱۹۴۵ء میں مع مقدمہ پروفیسر آل احمد سرور (ف ۲۰۰۲) شائع کیا۔ اس زمانے میں یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اگرچہ اعظمی صاحب کی یہ پہلی مطبوعہ کاوش تھی، لیکن آج یہ کتاب اور اس پر لکھا گیا سرور صاحب کا مقدمہ کہیں گم سا ہوگیا ہے۔ اس مقدمہ کا حسب ذیل پیراگراف اہم اور قابل توجہ ہے جو مولوی عبدالحق کی پیش کردہ اور ایک طبقے میں مقبول ترین رائے کی تردید کرتا ہے:

شبلی کے خطوط میں ان خطوں کو خواہ مخواہ اہمیت حاصل ہوگئی ہے جو انہوں نے عطیہ فیضی اور زہرہ فیضی کو لکھے تھے۔ دراصل ''مکاتیب شبلی'' ان کی علمی و ادبی زندگی کی بہتر ترجمانی کرتے ہیں۔ شبلی جذباتی آدمی تھے، پھر شاعر تھے، اچھی پڑھی لکھی خواتین سے متاثر ہوئے۔ وہ

ان کی صحبت سے لطف اٹھانے اور زندگی میں اچھے کام کرنے کا ولولہ حاصل کرتے تھے۔ان کی زندگی میں اس سے زیادہ ان خطوں کی اہمیت نہیں ہے۔مولوی عبدالحق صاحب کا یہ کہنا صحیح نہیں کہ ''ان کی تصانیف کو لونی لگنی شروع ہوگئی ہے، مگر یہ خط سدا بہار ہیں''۔ یہ خط دلچسپ ہیں اس لیے کہ شاید ایک عالم اور مفکر کے یہاں ہم اس قسم کی چیزوں کی توقع نہیں کرتے ، مگر ان کی بہت زیادہ اہمیت نہیں ہے ۔ یہ شبلی کی پوری شخصیت کو بے نقاب نہیں کرتے ،اس کے صرف ایک گوشے کی مصوری کرتے ہیں۔(ص:۱۴،۱۵)

(۵)

جہان شبلی کی قسط چہارم (مطبوعہ معارف اعظم گڑھ، جولائی ۲۰۱۳ء) میں سرسید احمد خاں (ف ۱۸۹۸ء) کے ایک کم معروف مجموعہ خطوط باسم ''خطوط سرسید'' (مرتبہ ڈاکٹر نسرین ممتاز بصیر،علی گڑھ،۱۹۹۵ء) کے حوالے سے ایک خط بنام حکیم احمدالدین مکتوبہ ۱۸؍ستمبر ۱۸۸۵ء نقل کیا گیا تھا،جس میں سرسید نے مولانا شبلی کے نام کے ساتھ لفظ ''مخدومی'' کا استعمال کیا ہے۔بعض پرستارانِ سرسید کو اس خط کے متن میں تحریف کا شبہہ ہے۔ان کا کہنا ہے کہ جب تک وہ قلمی مجموعہ خطوط (جس کی اساس نسخہ مذکور ہے) نہ دیکھ لیا جائے اس وقت تک لفظ مخدومی کے استعمال کو سرسید سے نسبت دے کر لکھنا درست نہیں ۔ دلیل کے طور پر ان کے پیش نظر سرسید اور شبلی کے درمیان عمر کا تفاوت ہے۔(یعنی شبلی سرسید سے چالیس سال چھوٹے تھے)

راقم الحروف نے اس لفظ کے استعمال کی مزید تین مثالیں تلاش کی ہیں۔تینوں مثالیں زیر گفتگو خط پر مرقوم تاریخ ۱۸؍ستمبر ۱۸۸۵ء کے بعد کی ہیں۔مثالیں بالترتیب حسب ذیل ہیں:

۱-مولانا شبلی کی کتاب ''المامون'' ۱۸۸۷ء میں پہلی مرتبہ مطبع العلوم علی گڑھ سے شائع ہوئی تھی ۔ ۱۸۸۹ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن مع دیباچہ سرسید احمد خاں شائع ہوا۔سرسید کے دیباچے پر ۲؍اکتوبر ۱۸۸۹ء مرقوم ہے۔سرسید نے لکھا ہے:

> ہم کو نہایت خوشی ہے کہ ہمارے دوست مخدوم اور ہمارے مدرسۃ العلوم کے پروفیسر مولوی محمد شبلی نعمانی نے اس کام کا بیڑا اٹھایا ہے اور ایک سلسلہ ہیروز آف اسلام کا لکھنا چاہا ہے،اسی سلسلے کی یہ کتاب ہے جو المامون کے نام سے موسوم ہے۔(دیباچہ المامون:۱)

۲-مولانا شبلی نے المامون (علی گڑھ ۱۸۸۷ء) کے بعد الفاروق لکھنا شروع کی تھی لیکن بعض مآخذ کی عدم دستیابی کے سبب اسے روک دیا گیا لیکن اس کے لکھے جانے کی عام شہرت ہوگئی۔اسی دوران راول پنڈی کے بیرسٹر منشی سراج الدین نے ''سیرۃ الفاروق'' کے نام سے ۱۸۹۳ء میں ایک کتاب لکھ کر شائع کردی۔شبلی کے عقیدت مندوں کو اس سے تکلیف پہنچی۔ اس موقع پر سرسید احمد خاں نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۱۰/ مارچ ۱۸۹۳ء میں منشی سراج الدین کے اس عمل پر رائے ظاہر کرتے ہوئے لکھا:''الفاروق کا لکھنا منشی سراج الدین کے قابو سے باہر تھا'' مزید لکھتے ہیں: بلکہ ہم تو سمجھتے ہیں کہ ہمارے مخدوم وحید العصر مولوی شبلی کے قابو سے بھی باہر ہے۔(بحوالہ حیات شبلی،ص:۲۳۵)

۳-سرسید احمد خاں کے شبلی کے نام صرف تین خط ملتے ہیں۔ایک خط مکتوبہ ۱۵/ستمبر ۱۸۹۵ء میں بھی لفظ مخدومی کا استعمال ملتا ہے۔یہ خط پہلی مرتبہ مکاتیب شبلی ج ۱/ میں سرسید کے نام شبلی کے خطوط کے حاشیے میں نقل ہوا ہے۔

(۵)

بیسویں صدی میں دو ہم نام ناموروں عبدالرزاق کانپوری (ف ۱۹۴۸) اور عبدالرزاق ملیح آبادی (ف ۱۹۵۹ء) نے علم وادب میں اپنی غیر معمولی صلاحیتوں سے قابل ذکر اضافے کیے۔ دونوں کی بعض تصانیف میں شبلی کے جابجا تذکرے ملتے ہیں۔موخرالذکر نے التباس سے بچنے کے لیے اپنی تصانیف پر صرف ملیح آبادی لکھنا کافی سمجھا۔تقریباً چار درجن کتب کے مصنف ومولف ملیح آبادی کی معروف کتاب ''آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی'' ہے، جو مولانا ابوالکلام آزاد کی وفات ۲۲/فروری ۱۹۵۸ء کے تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد اپریل ۱۹۵۸ء میں حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی سے پہلی بار شائع ہوئی۔اس کی اشاعت کے سال بھر بعد ۲۴/جون ۱۹۵۹ء کو ملیح آبادی کا انتقال ہوگیا۔ کتاب مذکور میں شبلی کا ۱۶ مقامات پر ذکر آیا ہے کہیں مختصر کہیں طویل،جس پر راقم الحروف ایک مستقل مقالہ ''سوانح آزاد میں اذکار شبلی'' کے عنوان سے قلم بند کرچکا ہے،جو شبلی اور آزاد مطبوعہ ۲۰۱۴ء دہلی میں شامل ہے۔

ملیح آبادی ہی کی ایک دوسری کتاب ''ذکر آزاد'' ہے جو ان کی یادداشتوں پر مشتمل ہے۔

ملیح آبادی کی وفات کے بعد ان کے بیٹے جناب احمد سعید ملیح آبادی نے دفتر آزاد ہند کلکتہ سے ۱۹۶۰ء میں پہلی بار اسے شائع کیا۔شبلی سے متعلق اس میں ایک دلچسپ واقعہ ہے جو متعدد جگہ نقل ہوتا رہا ہے لیکن اس واقعے کا اصل ماخذ یہی کتاب ہے۔اس کی واقعیت سے بحث نہیں یہاں صرف وہ جملے نقل کیے جاتے ہیں جو پورے قصے کے آخر میں ہیں کہ ''مگر علامہ کو سخت ذہنی صدمہ پہنچ چکا تھا،ہفتوں شگفتہ نہ ہو سکے''۔

(۶)

قاضی عبدالودود(ف ۱۹۸۴ء) کا ایک معروف مقالہ ''اصول تحقیق'' ہے،جو پہلی مرتبہ رسالہ آجکل دہلی کے اردو تحقیق نمبر (اگست ۱۹۶۷ء) میں شائع ہوا تھا۔ بعد میں متعدد جگہ نقل ہوا۔اس میں انہوں نے تحقیق کے لیے جو اصول وضع کیے ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ: ''محقق کو خطابت سے احتراز واجب ہے اور استعارہ وتشبیہ کا استعمال صرف توضیح کے لیے کرنا چاہیے آرائش گفتار کے لیے نہیں''۔اس سلسلے کی پہلی مثال کا تعلق شبلی کی کتاب ''اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر'' سے ہے۔(یہ کتاب پہلی مرتبہ لاہور سے ۱۹۰۹ء میں شائع ہوئی تھی)

قاضی صاحب لکھتے ہیں:

> شبلی کی جو کتاب عالم گیر پر ہے اس کا آغاز اس جملے سے ہوتا ہے۔''فلسفہ تاریخ کا ایک راز ہے کہ جو بات جتنی مشہور ہوتی ہے،اتنی ہی غلط ہوتی ہے''۔یہ صریحاً غلط ہے اور شبلی یہ کہنا چاہتے ہوں گے کہ شہرت صحت کی ضامن نہیں۔

شبلی کا صحیح جملہ یہ ہے:

> فلسفہ تاریخی کا یہ ایک راز ہے کہ جو واقعات جس قدر زیادہ شہرت پکڑ جاتے ہیں اسی قدر ان کی صحت زیادہ مشتبہ ہوتی ہے۔(اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر، اعظم گڑھ ۱۹۹۹ء،ص:۱)

قاضی صاحب نے ''واقعات'' کو ''بات'' اور لفظ ''مشتبہ'' کو ''غلط'' لکھ کر جملے کا مطلب کچھ سے کچھ سمجھانے کی کوشش کی اور شبلی پر اعتراض وارد کرنے کا جواز فراہم کرلیا۔

ناطقہ سر بہ گریباں کہ اسے کیا کہیے

استدراک

جناب الطاف احمد اعظمی

اپریل ۲۰۱۵ء کے ''معارف'' میں محترم محمد عمار خاں ناصر (پاکستان) کا ایک مضمون ''حنفی منہج اجتہاد میں احادیث و آثار کی اہمیت'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے۔ فقہی نقطۂ نظر سے یہ بڑا وقیع مضمون ہے۔لیکن بعض امور وضاحت طلب ہیں اور وہ درج ذیل ہیں:

۱- اہل علم جانتے ہیں کہ فقہائے عراق ''اہل الرائے'' کے نام سے معروف ہیں یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو بہت سے دینی مسائل میں حدیث و آثار پر رائے اور قیاس کو ترجیح دیتے ہیں۔لیکن فاضل مضمون نگار نے فقہائے احناف کی معروف کتابوں کے حوالے سے اس خیال کی تردید کی ہے۔اگر اس تردید کو درست مان جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک طویل عرصہ تک اہل حدیث اور فقہائے احناف اور ان کے حامی علماء کے درمیان جو فقہی نزاع برپا رہی ہے اور اب بھی گاہے گاہے ظہور میں آجاتی ہے، وہ کس بات پر تھی؟ فاضل مضمون نگار یقیناً واقف ہوں گے کہ اس نزاع کا تعلق دو باتوں سے تھا۔ایک یہ کہ کیا مالی و غیر مالی معاملات سے متعلق احادیث و آثار کی موجودگی میں رائے اور قیاس کی بنیاد پر استخراج احکام صحیح ہوگا، اس معاملے میں اہل حجاز یعنی اہل حدیث کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ احادیث صحیحہ اور صحابہ و تابعین کے مستند اقوال و آراء کو ہر معاملے میں قیاس اور رائے پر ترجیح حاصل ہے اور وہ ہر دور کے لیے واجب الاتباع ہیں۔لیکن حنفی فقہاء (فقہائے عراق) اس بات کو تسلیم نہیں کرتے۔وہ کہتے ہیں کہ بہت سے معاملات کا تعلق زمانہ کے احوال و ظروف سے ہے جو برابر بدلتے رہتے ہیں اس لیے ایک ایک خاص دور کے تمدنی حالات سے تعلق رکھنے والے احکام (احادیث و آثار) کو اس سے مختلف تمدنی حالات و کوائف پر

آر زیڈ-۹۰۱ بی، فلیٹ نمبر ۴۰۲، لین نمبر ۲۴، تغلق آباد ایکسٹنشن، نئی دہلی-۱۱۰۰۱۹

جوں کا توں منطبق نہیں کیا جا سکتا، ان کی اطلاقی صورتوں میں حسب ضرورت تغیر و تبدل ناگزیر ہے اور بایں صورت قیاس اور رائے کے بغیر چارہ نہیں ہے۔

ایسی کئی مثالیں موجود ہیں جن میں حنفی فقہاء نے صحیح حدیث کی موجودگی میں قیاس کو ترجیح دی ہے۔ مثلاً حدیث کی رو سے ۵ وسق سے کم غلہ اور پھل پر زکوٰۃ نہیں ہے (موطا، کتاب الزکوٰۃ، باب: **ما تجب فیه الزکوٰۃ اخرجه البخاری و سلم**) لیکن امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک ہر قسم کی پیداوار میں زکوٰۃ واجب ہے خواہ وہ پانچ وسق سے کم ہو۔ یہی صورت معاملات سے تعلق رکھنے والے دوسرے امور کی ہے کہ ان کے بارے میں حدیث و آثار کچھ کہتے ہیں اور حنفی فقہاء کی آراء و فتاویٰ کچھ اور ہیں (تفصیل کے لیے دیکھیں **کتاب الخراج لابی یوسفؒ**)۔ یہ صحیح ہے جیسا کہ فاضل مضمون نگار نے لکھا ہے کہ فقہائے احناف نے مرسل اور ضعیف روایتوں کو بھی قیاس پر ترجیح دی ہے۔ لیکن ان کا تعلق غیر قیاسی امور سے ہے، قیاسی امور میں انہوں نے مراسیل تو کیا مسند روایات سے بھی صرف نظر کیا ہے جیسا کہ اوپر ذکر ہوا۔ احادیث سے احکام کی علتیں اخذ کرنا اور ان پر جوں کا توں عمل کرنے میں بڑا فرق ہے۔

دوسری نزاع کا تعلق ''اخبار آحاد'' سے ہے۔ اہل حدیث عقیدہ کی طرح احکام میں بھی خبر واحد کو جب وہ قوی قرائن رکھتی ہو، واجب العمل سمجھتے ہیں (الصواعق المرسلہ، علامہ ابن قیم، ۲/۴۷۵، ارشاد الفحول، علامہ شوکانی، ص ۴۸، حدیث **الآحاد حجة فی العقاید و الاحکام**، شیخ محمد ناصر الدین البانی، ص ۴۵)۔ لیکن فقہائے احناف عقیدہ اور بنیادی احکام شرعیہ دونوں کا ماخذ صرف قرآن مجید اور مشہور آثار کو مانتے ہیں، خبر واحد کا انکار کرتے ہیں (الاسلام عقیدۃ و شرعیۃ، شیخ شلتوت، ص ۷۶، مزید دیکھیں ابوحنیفہ: حیاتہ وعصرہ، شیخ محمد ابوزہرہ، ص ۲۴۸)۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اخبار آحاد سے فروعی احکام مستنبط کیے جا سکتے ہیں لیکن یہ نہ فرض ہوتے ہیں، نہ واجب اور نہ ہی ان کا تارک مستوجب سزا ہے (**لا یعاقب بترکھا لانھا لیست بفریضة و لا واجبة**: کشف بزدوی (کشف الاسرار)، فخر الاسلام علی بن محمد بزدوی، ج ۲، ص ۳۱۰)۔

فقہائے احناف کے اس طرز فکر کے پیش نظر فاضل مضمون نگار کا یہ قول بے معنی ہو جاتا ہے کہ ''حدیث کے متعلق ائمہ احناف کا اصولی نقطۂ نظر کسی بھی طرح صحابہ و تابعین کے مستند

موقف سے مختلف نہیں اور وہ امت کے جمہور اہل علم کی طرح رائے اور قیاس کو کسی بھی پہلو سے حدیث پر مقدم قرار دینے کا رجحان نہیں رکھتے''۔ (محولہ مضمون، معارف، ص ۲۵۲)

۲- حنفی فقہ کی رو سے جیسا کہ فاضل مضمون نگار نے تفصیل سے لکھا ہے، سنت (حدیث) قرآن کے کسی حکم کو منسوخ کرسکتی ہے بشرطیکہ وہ مشہور یا متواتر ہو۔ (اہل حدیث کسی شرط کے بغیر اس کے قائل ہیں) اس کی دلیل یہ ہے کہ سنت بھی وحی ہے اس لیے اس کے ذریعہ حکم قرآن کی تنسیخ کو غلط نہیں کہا جاسکتا ہے۔ اس خیال کی تائید میں حنفی علماء وفقہاء سورۂ نحل کی آیت ۴۴ اور سورۂ النجم کی آیات ۳/اور ۴/ کو پیش کرتے ہیں اور ان کا ذکر زیر بحث مضمون میں بھی ہے۔ علمائے احناف اور اہل حدیث دونوں کی کتابوں میں ان سورتوں کے حوالے بہ کثرت ملتے ہیں۔ لیکن دلیل اور مدلول دونوں محل نظر ہیں۔

بہت سے محقق علماء کی رائے ہے اور راقم سطور بھی اسی کا قائل ہے کہ سنت (حدیث) قرآن مجید کے کسی حکم کو خواہ وہ جزئی ہو یا کلی، منسوخ نہیں کرسکتی ہے۔ اس سلسلے میں امام احمد بن حنبلؒ کی رائے قابل ذکر ہے:

قال الفضل بن زیاد : وسمعت احمد بن حنبل یقول لا تنسخ السنة شیئا من القرآن، قال لا ینسخ القرآن الا القرآن۔ (جامع بیان العلم، علامہ ابن عبدالبر، ج ۲، ص ۲۳۴)	فضل بن زیاد کہتے ہیں کہ میں نے احمد بن حنبل کا یہ ارشاد سنا ہے کہ سنت قرآن کی کسی بات کو منسوخ نہیں کرسکتی ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ قرآن کو صرف قرآن منسوخ کر سکتا ہے۔

امام حنبلؒ کی یہ رائے اس لیے قوی ہے کہ قرآن اصل اور سنت اس کی فرع ہے۔ اصل کو فرع منسوخ نہیں کرسکتی ہے اور یہ ایک بدیہی بات ہے۔ میں یہاں اس بحث میں نہیں پڑوں گا کہ کیا سنت (حدیث) پر وحی کا اطلاق اس طرح کرنا صحیح ہوگا جس طرح قرآن مجید پر اس کا اطلاق ہوتا ہے؟ لیکن اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے کہ قرآن لفظاً محفوظ ہے جب کہ روایات کو یہ حفاظت حاصل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیثوں (سنتوں) میں اختلاف ملتا ہے جب کہ قرآن ہر طرح کے اختلاف سے مامون ہے۔ مزید برآں معاملات سے متعلق سنتیں احوال وظروف کے

بدل جانے سے تبدیل ہوسکتی ہیں۔لیکن قرآن مجید زمانے کے تغیرات سے مکمل طور پر آزاد ہے کہ وہ اصول وکلیات پر مشتمل کتاب ہےاور کلیات نا قابل تبدیل ہوتے ہیں۔

جن حنفی علماء وفقہاء نے سورۂ نحل اور سورۂ النجم کی آیات کی بنیاد پر سنت (حدیث) کے ذریعہ احکام قرآن کی تنسیخ کی بات کہی ہےانہوں نے ان آیات کے مفہوم کے سمجھنے میں خطا کی ہے اوراس ارتکاب خطا میں دوسرے مسالک کے علماء وفقہاء بھی شریک ہیں۔اس خطا کا تعلق سورۂ نحل میں ''لتبیّن'' کے فقرہ سے ہے۔لغوی اعتبار سے ''تبیین'' کے ایک معنی توضیح کے اور دوسرے معنی جوں کا توں یعنی مطابق اصل بیان کرنے کے ہیں اور دونوں معنی کی نظیریں قرآن مجید میں موجود ہیں۔سورۂ نحل کی زیر بحث آیت میں یہ موخرالذکر معنی میں استعمال ہوا ہےیعنی جوں کا توں (کسی کم وکاست کے بغیر) بیان کرنا۔اس معنی کے لحاظ سے آیت کا ترجمہ ہوگا:''(اے نبی) ہم نے تمہاری طرف ذکر (یعنی قرآن) نازل کیا ہے تاکہ تم اس چیز کو جو لوگوں کی طرف نازل کی گئی ہے جوں کا توں ان سے بیان کردو''۔اسی معنی میں ایک دوسری جگہ فرمایا گیا ہے:

یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَہٗ (سورۂ مائدہ:۶۷)	اے رسول، جو چیز تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کی گئی ہے اسے (جوں کا توں لوگوں تک) پہنچادو اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو (درحقیقت) تم نے اس کا پیغام پہنچایا ہی نہیں۔

تبیین کے برخلاف عمل کتمان ہے جیسا کہ علمائے یہود کے ذکر میں فرمایا ہے:

یٰٓاَھْلَ الْکِتٰبِ قَدْ جَآءَ کُمْ رَسُوْلُنَا یُبَیِّنُ لَکُمْ کَثِیْرًا مِّمَّا کُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْکِتٰبِ وَیَعْفُوْا عَنْ کَثِیْرٍ (سورۂ مائدہ:۱۵)	اے اہل کتاب، ہمارا رسول تمہارے پاس آ گیا ہے، کتاب (یعنی تورات) کی بہت سی باتوں کو جنہیں تم چھپا رہے ہو، تم سے کھول کر بیان کرتا ہے اور بہت سی باتوں سے چشم پوشی کرتا ہے۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ قرآن مجید میں سورۂ نحل کے علاوہ تقریباً ہر جگہ ''تبیین'' کی

نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے۔متعدد سورتوں میں آیات احکام کے بعد بالعموم ''کذالک یبین اللّٰہ لکم '' الخ یا اس کے مماثل جملہ آیا ہے (دیکھیں سورۂ بقرہ: ۲۲۱، ۲۴۲، نسآء: ۲۶، ۱۷۷، سورۂ نور: ۱۸، ۵۸، ۵۹، ۶۱)۔اس کے علاوہ سورۂ قیامہ میں صاف لفظوں میں کہا گیا ہے: ثم ان علینا بیانہ (آیت ۱۹) ''ہمارے ہی ذمہ ہے اس کی وضاحت'' اور اس وعدہ کے مطابق اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کے جملہ مجملات کی توضیح ''تصریف آیات'' کے ذریعہ کردی ہے (سورہ انعام: ۶۵)۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس توضیح کے بعد علماء کا علی الاطلاق یہ کہنا جیسا کہ فاضل مضمون نگار نے لکھا ہے کہ ''تبیین کی ذمہ داری نبی ﷺ کو تفویض کی گئی ہے'' غلط اور حقیقت واقعہ کے خلاف ہے۔ نبی ﷺ کے ذمہ فی الواقع مجمل آیات احکام کی تبیین یعنی عملی تفصیل تھی، اور یہ کام آپ ﷺ نے اپنے عہد کے حالات کے لحاظ سے بحسن وخوبی انجام دیا۔

سورہ النجم کی آیات (۳، ۴) کے مفہوم کے سمجھنے میں جو غلطی ہوئی اس کی وجہ نظائر قرآن سے بے توجہی ہے۔اس سے بھی بڑی غلطی آیت کی یہ تفسیر ہے: ''اللہ تعالیٰ نے نبیؐ کے بارے میں یہ ضمانت دی ہے کہ وہ دین کے معاملے میں کوئی بات اپنی خواہش سے نہیں کہتے بلکہ وحی کی بنیاد پر کہتے ہیں''۔ (دیکھیں معارف، محولہ مضمون، ص ۴۵۲)۔آیت کی یہ تفسیر صحیح نہیں ہے۔ان آیات میں اس بات کا ذکر نہیں ہوا ہے کہ نبیؐ دین کے معاملے میں جو بات کہتے ہیں وہ وحی کی بنیاد پر کہتے ہیں بلکہ ان آیات کے ذریعے جیسا کہ سیاق کلام سے واضح ہے، کفار مکہ کے اس لغو الزام کی تردید کی گئی ہے کہ محمد (ﷺ) راہ راست سے بھٹک گئے ہیں اور وہ جو کلام پیش کرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں ہے بلکہ انہوں نے اپنے جی سے اسے گھڑ لیا ہے۔کفار کے اس باطل خیال کا ذکر دوسری سورتوں میں بھی ہوا ہے۔(دیکھیں سورۂ یونس: ۳۷، ۳۸، ھود: ۳۵، احقاف: ۸، مدثر: ۲۵)

۳- اکثر علماء حدیث اور سنت کو ہم معنی اصطلاح کے طور پر استعمال کرتے ہیں حالانکہ ان میں کئی لحاظ سے فرق ہے۔ نبی ﷺ کے بہت سے ارشادات کا تعلق توحید، رسالت، معاد، قصص انبیاء اور متعدد پیشین گوئیوں سے ہے۔کھلی بات ہے کہ ان امور پر معروف معنی میں سنت

کا اطلاق نہیں ہوسکتا ہے۔ دوسرے علماء کی طرح فاضل مضمون نگار نے بھی حدیث اور سنت کے فرق کو ملحوظ نہیں رکھا ہے۔

اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ذہن نشین کرنے کی ہے کہ سنت قرآن مجید سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ حضرت عائشہؓ کا قول ''کان خلقه القرآن'' اس پر دلیل ہے۔ بہت سے محقق علماء نے یہی بات لکھی ہے۔ امام شافعیؒ کا قول ہے کہ نبی ﷺ کے جملہ ارشادات کا ماخذ قرآن مجید ہے (مقدمہ فی اصول التفسیر، امام ابن تیمیہؒ ص ۹، مزید دیکھیں الاتقان فی علوم القرآن، امام سیوطیؒ) علامہ شاطبیؒ کا بھی یہی خیال ہے اور انہوں نے اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کی ہے۔ (دیکھیں الموافقات ج ۴، ص ۷، ۸)

اس اعتبار سے نبی ﷺ کے جملہ ارشادات دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ جو آیات قرآن کی تفصیل مزید کی حیثیت رکھتے ہیں اور دوسرے وہ ارشادات جن کا تعلق مجمل آیات احکام کی عملی توضیح سے ہے، مثلاً نماز اور زکوٰۃ وغیرہ احکام کی عملی تفصیل۔ یہ تعبدی سنن ہیں اور تواتر عمل کے ذریعہ بڑی حد تک محفوظ ہیں۔ ان کے علاوہ جو اقوال و اعمال نبی ﷺ کی طرف منسوب ہیں ان کو اسی صورت میں آپ ﷺ کا قول و فعل تسلیم کیا جائے، جب وہ روایت اور درایت دونوں کے مسلمہ اصولوں کی روشنی میں درست ثابت ہوں۔ افسوس کہ آج تک ان اقوال کو جنہیں ''اخبار آحاد'' کہا جاتا ہے اور جن کی تعداد زیادہ ہے درایت کی کسوٹی پر نہیں پرکھا گیا اور نہ ہی ان کا ضعف و قوت معلوم کرنے کے لیے قرآن مجید کو معیار قرار دیا گیا۔ اس غفلت کی وجہ سے حدیث کی کتابوں میں آج بھی ایسی روایات موجود ہیں جو اصول درایت اور نص قرآن سے متصادم ہیں۔ یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں، صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں۔

نبی ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر جو بصیرت افروز خطبہ دیا اس کے آخر میں فرمایا کہ اے لوگو! میں تم میں ایک چیز چھوڑے جا رہا ہوں، اگر تم اس کو مضبوطی سے پکڑے رہو گے تو ہرگز گمراہ نہ ہوگے۔ یہ چیز کیا تھی؟ اس سلسلے میں تین مختلف روایتیں ملتی ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ وہ چیز کتاب اللہ ہے۔ (صحیح مسلم، حدیث نمبر ۱۲۱۸) دوسری روایت کے مطابق جو مرسل ہے، وہ چیز کتاب اللہ اور اس کے نبی کی سنت ہے۔ (موطا، حدیث نمبر ۲۶۱۸) تیسری روایت ہے کہ وہ

چیز کتاب اللہ اور اہل بیت ہیں۔(المعجم الکبیر، حدیث نمبر ۲۶۸) راقم سطور کے نزدیک صحیح مسلم کی حدیث صحیح ہے کہ وہ نص قرآن کے مطابق ہے (سورۂ آل عمران: ۱۰۳)۔ ''مسلم'' میں اس مضمون کی ایک اور حدیث ہے جس میں کتاب اللہ کے ساتھ اہل بیت کا ذکر ہے۔ اہل بیت (عترتی اہل بیتی) راوی کا اضافہ ہے۔

لیکن قارئین کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ سنی علماء وفقہاء نے صحیح مسلم کی مرفوع روایت (حدیث نمبر ۱۲۱۸) کو چھوڑ کر جس کی تائید نص قرآن سے ہوتی ہے، موطا کی مرسل روایت کو جو نص قرآن (آل عمران: ۱۰۳) سے متعارض ہے۔ تشریح دین کا ماخذ قرار دیا ہے۔ چنانچہ سنی علماء کی کتابوں میں یہی روایت بیان کی گئی ہے کیونکہ اس سے ان کے مزعومہ مسلک کی تائید ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف اہل تشیع نے نص قرآن سے صرف نظر کر کے ''المعجم الکبیر'' کی روایت کو ترجیح دی جو ان کے مسلک کے مطابق ہے۔ **فاعتبروا یا اولی الابصار**۔

اہل روایت کے ایک غالی طبقہ نے نبی ﷺ کے دوسرے متعدد اقوال میں بھی جزئی تحریفات کی ہیں جن سے قول رسول کا منشاء تبدیل ہو گیا ہے۔ ان تحریفات سے بہت کم مسلمان واقف ہیں۔ اس تحریف کے علاوہ بہت سی موضوع اور ضعیف روایتیں بھی مجموعۂ حدیث میں موجود ہیں۔ ان سب جعلی اور ناقص روایات کی نشاندہی بہت ضروری ہے۔ لیکن اس کام کے لیے اجتماعی عمل درکار ہے اور اس سے بھی زیادہ ضروری چیز مسلکی تعصب سے دست برداری ہے۔ راقم الحروف کی نظر میں فاضل مضمون نگار اس ''کار تنقیح'' کی انجام دہی کے لیے ہر طرح موزوں ہیں۔ اگر وہ چند قابل افراد پر مشتمل ایک جماعت کو ساتھ لے کر یہ کام کر سکیں تو مسلمانوں کی آیندہ نسلیں ان کی احسان مند ہوں گی۔

اخبار علمیہ

''سالانہ ۲ کروڑ قرآن کی طباعت''

قرآن مجید کی طباعت کرنے والا ادارہ ''فہد کمپلکس'' تقریباً تیس برس قبل قائم کیا گیا تھا۔اس وقت اس ادارہ کو قرآن کی طبع و اشاعت کے لیے دنیا کے سب سے بڑے مرکز ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ادارہ کے رابطہ منیجر شیخ صالح حسین کے بیان کے مطابق اب تک دنیا کی ۶۳ زبانوں میں قرآن مجید کو منتقل کیا گیا ہے۔طباعت سے قبل آیتوں ،سورتوں ،نقطوں ،حرکتوں اور رموز و اوقاف کی کتابت و خطاطی کو ۵ مرحلوں سے گزارا جاتا ہے۔ادارہ میں کل ۱۸ سو ملازمین ہیں،طباعت کے شعبہ میں ۸ سو اور کتابت کے لیے ایک ہزار افراد مامور ہیں اور سالانہ ۲ کروڑ نسخوں کی طباعت ہوتی ہے۔ (راشٹریہ سہارا، ۳؍جون ۲۰۱۵ء)

''بچوں میں ہائی بلڈ پریشر کا خطرہ''

دنیا کے متعدد تعلیمی مراکز کے محققین نے یورپی یونین کے ۸ ممالک کے ۲ سے ۱۰ برس کے تقریباً پانچ ہزار بچوں کی ۲ برس تک نگرانی کی ۔نتیجۂ تحقیق یہ آیا کہ جو بچے روزانہ ۲ گھنٹہ سے زیادہ ٹی وی اسکرین نظریں جماتے تھے وہ ۲ برس بعد ہائی بلڈ پریشر کے خطرے میں تھے،مطالعہ میں ہر ۱۰ میں ایک بچہ میں ہائی بلڈ پریشر نوٹ کیا گیا،جو قلب کے مرض کی ایک بڑی وجہ ہے۔اس کے علاوہ اس سے سی وی ڈی ایس بیماری کا اندیشہ بھی بڑھ جاتا ہے۔اس جائزہ میں شامل ساؤپولو یونیورسٹی سے وابستہ محقق نے کہا کہ بلڈ پریشر کے مریضوں میں جسمانی فعالیت اور غیر فعال طرز زندگی کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔اس لیے بچوں کو ان خطرات سے محفوظ رکھنے کی جانب توجہ دینا ضروری ہے۔(انٹرنیشنل کارڈیالوجی جرنل،بحوالہ اخبار مشرق، ۲۸؍مئی ۲۰۱۵ء)

''۵۰ برس اور ۵۵ نکاح''

شمال مغربی افریقہ میں واقع موریطانیہ کی رہنے والی سلم نامی خاتون نے ۵۰ برس کی عمر میں ۵۵ نکاح کرکے عالمی ریکارڈ بنایا ہے۔سی این این عربی کی رپورٹ کے مطابق اس خاتون کو دنیا میں سب سے زیادہ شادی کرنے کا امتیاز حاصل ہے۔خاتون کا بیان ہے کہ اس کی شادی شدہ زندگی کا آغاز ۱۲ برس کی عمر

سے ہوا اور اس کی طویل ترین شادی کی عمر ۱۵ برس کی تھی۔ ورنہ بعض شادیاں ۳ ماہ سے دو ہفتے اور کچھ تو دو دن بہار جاں فزا دکھلا کر مرجھا گئیں۔ اس کثرت تعدد کی اصل وجہ اس خاتون کے بیان کے مطابق اس کا مغلوب الغضب ہونا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے ایک وجہ شوہروں کے حسد اور ان کے غیر ذمہ دارانہ رویہ کو بھی قرار دیا ہے۔ اس کے بیان کے مطابق صرف تین شوہر ایسے تھے جن کے ساتھ اس نے خود کو محفوظ تصور کیا تھا۔ اس کو اپنے تمام شوہروں کے نام یاد ہیں۔ واضح رہے کہ موریطانیہ میں طلاق کو سماجی روایت کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ طلاق کے بڑھتے رجحان کے سبب ۴۴ فیصد عائلی خاندانی نظام درہم برہم ہوگیا ہے۔ عورتوں کو نان نفقہ اور رہائش جیسی بنیادی سہولت شوہر کی طرف سے حاصل نہیں ہیں۔ بیشتر عورتیں اپنے حق مہر سے بھی محروم ہیں۔ رپورٹ کے مطابق عقد نکاح کے دوران شوہر کہتا ہے کہ ''وہ اپنی بیوی کے نان نفقہ کا ذمہ دار نہیں ہے۔ عورت اپنے معاملات کی خود یا اس کا ولی ذمہ دار ہے''۔ یہ شرط نکاح نامے میں درج کی جاتی ہے۔ اس شرط کے سبب نباہ نہ ہونے کی صورت میں عورت خود ہی طلاق کا فیصلہ کرلیتی ہے۔ تاہم اس کے باوجود سلم نے نصیحت کی ہے کہ دوسرے اس کی پیروی ہرگز نہ کریں۔ پہلا شوہر جیسا بھی ہو اسی کے ساتھ بسر کریں کیونکہ اچھے شوہر کی تلاش میں عورت کہیں کی نہیں رہتی۔ (منصف، حیدرآباد، ۱۴/ مئی میں تفصیلی خبر موجود ہے)

''انگلیوں پر تسبیح کا فائدہ''

ایکیوپنکچر اور ایکیو پریشر یہ چینی طریقہ علاج کی قدیم قسمیں ہیں اور اب یہ دوسرے ملکوں میں بھی مقبول ہیں۔ حال ہی میں یہ تحقیق سامنے آئی ہے کہ ایسے لوگوں کو حرکت قلب بند ہوجانے کا اندیشہ کم ہوجاتا ہے جو انگلیوں پر تسبیح پڑھتے ہوں۔ کیونکہ اس طرح سے ایکیو پریشر طریقۂ علاج کے مطابق دل صحت مند رہتا ہے۔ (الشفا، نئی دہلی، جون ۲۰۱۵ص ۶۸)

''روبوٹک سوٹ''

یونیورسٹی آف اسکوبا گریجویٹ اسکول کے ایک استاد نے ۲۰ سال کی محنت شاقہ کے بعد ایسا روبوٹک سوٹ تیار کیا ہے جس کو پہن کر ایک معذور اور کمزور شخص بھی ۶۰ کلو وزنی چیز آسانی سے اٹھا سکتا ہے۔ اس سوٹ میں لگے حسیاتی آلہ جات دماغ سے پاؤں تک آنے والے اشاروں کو وصول کرتے ہیں

اور پھر ٹانگوں کے پٹھوں کو حرکت دینے میں مدد دیتے ہیں۔فی الحال یہ سوٹ جاپان میں ۲ ہزار ڈالر ماہانہ کرایہ پر دستیاب ہے۔ (اخبار مشرق، ۲۷؍مئی ۲۰۱۵ء)

’’i Plus کو منظوری‘‘

ہندوستان میں متعدد ٹی وی چینل ہیں جن سے اردو و دیگر زبانوں میں متعدد دینی، ادبی اور اسلامی موضوعات پر پروگرام نشر ہوتے ہیں، لیکن اب تک کوئی خالص اسلامی ٹی وی چینل نہیں تھا۔خوشی کی بات ہے کہ مرکزی وزارت اطلاعات ونشریات نے i Plus نام سے پہلے اسلامی ٹی وی چینل کو منظوری دی ہے۔اس چینل نے اپنی نشریات بھی شروع کردی ہے۔چینل سے وابستہ متعلقین اور ذمہ داروں نے ناظرین کی پسند کے مطابق ایسے پروگرام تیار کیے ہیں جن سے سماجی، معاشرتی اوراخلاقی اصلاح کا کام لیا جاسکے۔مثلاً پکوان سے متعلق رسوئی پلس میں حلال وحرام کھانوں کی تمیز سکھائی جاتی ہے۔ازدواجی تعلقات میں تلخیوں کے اسباب تلاش کرکے ان کے حل پیش کیے جاتے ہیں، حالات حاضرہ کے موضوع پر مباحثے اورخاندانی ڈرامے بھی پیش کیے جاتے ہیں۔(اخبار مشرق، ۲۳؍مئی ۲۰۱۵ء)

’’ریت خور سدھاما دیوی‘‘

سدھاما دیوی کا تعلق کجری نور پور سے ہے۔اس وقت اس کی عمر ۹۲ سال ہے۔’’جاگرن پوسٹ‘‘ کی رپورٹ کے مطابق اس نے ۱۲؍برس کی عمر سے ریت خوری شروع کی اور ۸۰ برس سے روزانہ ۴ پلیٹ ریت کھارہی ہے اوراب تک اس نے کل ۲۹ ٹن ریت کھانے کا عالمی ریکارڈ بنایا ہے۔ڈاکٹروں کے معائنے کے مطابق ریت خوری کی وجہ سے اسے اب تک کسی بھی قسم کا جسمانی عارضہ لاحق نہیں ہوا اور وہ صحت مند ہے۔سدھاما سے سات لڑکے اور تین لڑکیاں ہیں اور کسی پر بھی اس کی ریت خوری کے سبب بیماری کا اثر نہیں ہوا۔سب بالکل صحت مند و چاق چوبند ہیں۔ڈاکٹروں کا بیان ہے کہ اس کا جسم اور معدہ ریت کو بآسانی ہضم کرلیتا ہے اوراس کی صحت پر کوئی منفی اثر مرتب نہیں ہوتا۔سدھاما مختلف پھلوں جیسے امرود کی کاشوں وغیرہ پر نمک مرچ کی طرح ریت لگا کر کھاتی ہے۔برطانوی جریدہ ’’ڈیلی میل‘‘ کی آن لائن رپورٹ میں مقامی ڈاکٹروں کی طرف سے اس کی حیران کن صحت پر حیرت کا اظہار کیا گیا ہے۔(تفصیلی رپورٹ منصف حیدرآباد، ۱۷؍مئی میں دیکھی جاسکتی ہے)

ک،ص اصلاحی

معارف کی ڈاک

علامہ شبلی نعمانی کی ایک تقریظ

بنگلور، کرناٹک

محترمی ومکرمی!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

دیگر عرض اینکہ ''معارف'' مارچ ۲۰۱۵ء باصرہ نواز ہوا، یادفرمائی کاشکریہ۔''آثار علمیہ و تاریخیہ'' کے تحت شامل شدہ جناب ڈاکٹر عارف نوشاہی (اسلام آباد) کا مضمون ''علامہ شبلی نعمانی کی ایک تقریظ'' قابل قدر ہے۔ڈاکٹر صاحب نے علامہ شبلیؒ کی تقریظ نقل کرنے سے پیشتر ''دستور نامۂ فارسی'' کے مصنف مولانا حکیم حسین شریف حکمی بنگلوری کے کچھ احوال بیان کیے ہیں جس میں انہوں نے لکھا کہ:

> ''یہ مولوی حکیم حسین شریف بنگلوری کی تصنیف ہے جو شاعری میں ''حِکمی'' تخلص کرتے تھے۔شاعری میں قلندر حسین متخلص بہ اطہرؔ اور دیگر علوم میں مولانا ابوالخیرات سید احمد دہلوی مدرس اول مدرسۂ اسلامیہ دیوبند کے شاگرد تھے۔کتاب کے سرورق پر مصنف کی مکانی نسبت ''بنگلوری'' لکھی ہے لیکن کتاب کی پشت پر چھپے ایک اعلان میں اس کا پتہ گلزار حوض، حیدرآباد دکن درج ہے''۔(ص:۲۳)

مذکورہ عبارت پر کچھ عرض کرنے سے پہلے اس بات کا اظہار بے جانہ ہوگا کہ گذشتہ صدی سے دو دہائی پیشتر فارسی زبان وادب کے دوگرانقدر آثار کا پتہ چلتا ہے۔ان میں سے ایک ''فرہنگ آنندراج'' (۱۳۰۷ھ-۱۳۱۲ھ-مطابق ۱۸۸۹ء-۱۸۹۴ء) ہے جس کے مولف منشی محمد پادشاہ شادؔ ہیں۔انہوں نے تقریباً تین ہزار صفحات پر مشتمل اپنی ضخیم لغت کو وطن مالوف ''وجیانگرم'' کے راجہ مرزا آنند گجپتی راج سلطان بہادر K.C.I.E کے نام سے منسوب کرتے ہوئے ''فرہنگ آنندراج''

نام رکھا جو اولاً مطبع منشی نول کشور لکھنؤ سے پھر ایران سے شائع ہوئی۔ دوم ''دستور نامہ فارسی'' (۱۳۱۰ھ ۱۳۱۸ھ - مطابق ۱۸۹۲ء - ۱۹۰۰ء) ہے جو مولانا حکیم حسین شریف حُکمی بنگلوری کی تصنیف ہے، حضرت حکمی (بضم حاء) بنگلور کے متوطن تھے اور حکماء واطبا کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے، ابتدائی تعلیم بنگلور میں ہوئی، اساتذہ میں حضرت مولانا محمد قلندر حسین اطہر بنگلوری (متوفی ۱۲۹۶ھ) کا اسم گرامی قابل ذکر ہے جنھوں نے مشہور شیخ وقت حضرت سید شاہ عبداللطیف قادری نقوی ویلوری معروف بہ قطب ویلور (متوفی ۱۲۸۹ھ) سے فیض باطنی پایا تھا اور شیخ کے مدرسہ میں رہ کر علوم متداولہ سے فراغت بھی حاصل کی تھی، بعد ازاں حضرت اطہر نے اپنے شیخ کے حکم سے بنگلور میں ایک مدرسہ قائم کیا جہاں حضرت حکمی کا داخلہ ہوا اور انہیں کتب فارسی، عربی اور ادبیات کی تعلیم دی گئی چنانچہ مدرسۂ اطہر کے ساتھیوں میں مولانا محمد علی فاضل اور مولانا قاضی محمد عبداللہ حسین خلیل (متوفی ۱۳۵۲ھ) کے اسمائے گرامی نمایاں ہیں۔ (ڈاکٹر راہی فدائی دارالعلوم لطیفیہ، ویلور کا ادبی منظر نامہ، مطبوعہ ابوالحسان اکادمی، کڈپہ ۱۹۹۷ء ص: ۲۶۰)۔ بعد ازاں حضرت حکمی مزید تعلیم کے لیے دیوبند روانہ ہوئے جہاں مولانا ابوالخیرات سید احمد دہلوی صدر مدرس دارالعلوم دیوبند سے جو منصب صدر مدرس پر ۱۳۰۲ھ تا ۱۳۰۷ھ فائز رہے، شرف تلمذ حاصل کرنے کا زریں موقع ہاتھ آیا۔ دیوبند سے فراغت کے بعد وہ حیدرآباد دکن منتقل ہوگئے، وہاں انہوں نے ''گلزار حوض'' پر اپنا مطب شروع فرمایا، اسی دوران اپنے یار غار قاضی محمد عبداللہ حسین خلیل کے اصرار پر ''دستور نامہ فارسی'' کی تصنیف کا آغاز کیا جس کا اختتام ۱۳۱۰ھ مطابق ۱۸۹۲ء میں ہوا۔ حضرت حکمی نے اپنی اس موقر کتاب کے تکملہ کی تاریخی نظم خود کہی ہے جس کے آخری دوشعر اس طرح ہیں۔

بنا گہ خرد سوئے او یافت راہ   کہ دستور نامہ افادت پناہ

۱۳۱۰ھ

دگر سال او کلک گوہر سرشت   ''گلستان نازک خیالی'' نوشت

۱۳۱۰ھ

وہ پورے آٹھ سال تک اپنی اس بے نظیر کتاب کے مسودے پر مزید غور وفکر کرتے رہے، آخر کار ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۰ء میں اس کو زیور طباعت سے آراستہ کرنے کی نوبت آئی۔

اس تصنیف لطیف کی چھپائی پر اس دور کے ماہر فن تاریخ مولانا حافظ حفیظ اللہ فانیؔ اعظم گڈھی نے درج ذیل قطعہ تاریخ کہا تھا۔

چھپی مجتبائی میں باصد صفائی — یہ نادر کتابِ افاضت شمامہ
کہو مصرعِ سال مطبوع فانیؔ — ''چھپا ہے بہت عمدہ دستور نامہ''

۱۳۱۸ھ

''دستور نامہ فارسی'' کی مطبع مجتبائی، دہلی سے اعلان طباعت کے باوجود کسی وجہ سے اس کی اشاعت ۱۳۲۱ھ مطابق ۱۹۰۳ء- ۱۹۰۴ء تک مؤخر ہوتی رہی، جب ۱۳۲۱ھ میں اس کی اشاعت باقاعدہ ہوگئی تو مختلف احباب نے تاریخی قطعے رقم کیے ان میں مطبع کے منیجر جناب محمد بیگ نے ایک خوبصورت قطعہ کہا تھا جو اس طرح ہے۔

وَہ وَہ چہ بلیغے و مضامین جدیدہ — طرزے کہ نہادست نہ دیدہ نہ شنیدہ
تاریخ نوشتم سرِ اطناب بریدہ — ''نوبادۂ ابحاث شریفہ و مفیدہ''

ا — ۱۳۲۲ھ
ـ ا
۱۳۲۱ھ

۲۹۲ صفحات پر مشتمل اس ضخیم کتاب کے آخر میں علامہ شبلی نعمانیؒ کی عمدہ تقریظ موجود ہے جس میں علامہ نے بجا طور پر مصنف کی خوب تعریف وتوصیف کی ہے اور اس پر ۱۷ر فروری ۱۹۰۴ء کی تاریخ درج ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تقریظ تاخیر سے موصول ہوئی تھی جس کے باعث اس کو صحیح مقام نہ مل سکا۔

حضرت حکمیؔ کے اہل خاندان ان کے دیوبند جانے سے پیشتر ہی بنگلور سے آرکاٹ کے قریب واقع قصبہ نول پور (NAVALAPUR) منتقل ہوگئے تھے۔ ان کا مطب علمی مشاغل کی وجہ سے ٹھیک سے چل نہ سکا جس کی وجہ سے حیدرآباد کا قیام ترک کرکے نول پور آگئے۔ ان کے گہرے مراسم مدرسۂ باقیات صالحات ویلور (قائم شدہ ۱۲۷۹ھ مطابق ۱۸۶۲ء) کے بانی اعلیٰ حضرت شاہ عبدالوہاب قادری ویلوری علیہ الرحمہ (ولادت: ۱۲۴۸ھ - وفات: ۱۳۳۷ھ) کے ساتھ تھے اور ان کا شمار حضرت بانی علیہ الرحمہ کے معتقدوں میں ہوتا تھا۔ یہ اس لیے کہ حضرت

حکمی امام العارفین حضرت شاہ امداد مہاجر مکیؒ (متوفی ۱۳۱۷ھ) کے مشہور خلیفہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ (متوفی ۱۳۲۳ھ) کے فیض یافتہ و مرید تھے جس کا ثبوت حضرت حکمی کے ان کلمات سے ہوتا ہے جو حضرت گنگوہی کی شان میں (سیدی، وسندی ووسیلتی فی الیوم والغد) کہے گئے ہیں جبکہ حضرت گنگوہی نے ''دستور نامہ فارسی'' کی تحسین کرتے ہوئے فرمایا تھا ''بندہ کی دانست میں مولوی صاحب مولف نے بہت اچھا لکھا ہے، قابل تحسین ہے۔ فقط کتبہٗ الراجی برحمۃ ربہٖ رشید احمد گنگوہی عفی عنہ۔ اسی طرح اعلیٰ حضرت بانی باقیات بھی شاہ امداد اللہ مہاجر مکیؒ کے خلیفہ اور حضرت گنگوہیؒ کے پیر بھائی تھے، بانی باقیات نے حضرت حکمی کو اس دیہات (نول پور) سے ویلور منتقل ہونے پر اصرار کیا، بایں وجہ وہ شہر ویلور میں قیام پذیر ہوگئے اور ویلور ہی میں ان کا انتقال ہوا، مدرسہ باقیات صالحات کے قریب واقع مسجد خُرد (چھوٹی مسجد) کے قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ ان کی دیگر تصانیف میں ''سفینۃ الجواہر'' ہے جس کا مخطوطہ مدرسۂ باقیات صالحات کے کتب خانے کا مخزونہ ہے۔ حضرت حکمی نے فارسی کی معروف لغت ''بہار عجم'' (مولف ٹیک چند بہار) پر جابجا گرفت کی ہے۔ کتاب کے حاشیہ پر یادداشتیں لکھی ہیں، یہ نسخہ بھی مدرسۂ باقیات صالحات میں موجود ہے، ان کی اولاد واخلاف میں سے حکیم عبدالرب نول پوری نے حضرت حکمی کی تقریباً ڈھائی سو کتابیں مدرسہ کے کتب خانے کے لیے وقف کردی تھیں جن کا اندراج مدرسہ کے دفتر میں کیا گیا تھا (علامہ فدوی باقویؒ ''مجدد جنوب'' ناشر مدرسہ باقیات صالحات، ویلور، ٹمل ناڈو، مطبوعہ ۱۹۷۴ء، ص ۴۵/۴۴)۔

الغرض راقم الحروف نے اپنے علم واطلاع کے مطابق حضرت حکیم حسین شریف حکمی سے متعلق مذکورہ احوال پیش کردیئے ہیں تاکہ قارئین ''معارف'' کی معلومات میں اضافہ ہو اور مستقبل میں حضرت حکمی پر تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے صحیح سمت مقرر ہو۔

والسلام

(جناب ڈاکٹر) راہی فدائی

حنفی منہج اجتہاد

مدینہ منزل،
نیو سرسید نگر، علی گڑھ
۶؍مئی ۲۰۱۵ء

محترم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

معارف کا اپریل ۲۰۱۵ء کا شمارہ ملا۔ اس میں محمد عمار خاں ناصر کا مقالہ ''حنفی منہج اجتہاد میں احادیث وآثار کی اہمیت'' شائع ہوا ہے۔ اس مقالہ میں فاضل مقالہ نگار نے یہ نہیں بتایا کہ جب امام ابوحنیفہؒ آثار واحادیث پر اپنے منہج کی بنیاد رکھتے تھے تو پھر وہ اہل الرای کیوں مشہور ہوگئے؟ اس کے اسباب سے عمار صاحب نے بالکل بحث نہیں کی۔ ان کے تسامح کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ خود امام مالکؒ اصحاب الرای میں تھے۔ اور صحیح احادیث کو چھوڑ کر وہ اپنی رائے کو ترجیح دیتے تھے چنانچہ علامہ ابن قیم اعلام الموقعین میں لکھتے ہیں کہ اے مالکیو! تم صحیح اور مرفوع حدیث کو چھوڑ کر نماز میں ارسال کرتے ہو صرف امام مالک کے ایک قول کی بنا پر کہ مجھے ارسال پسند ہے ہاتھ باندھ کر نماز پڑھنے سے۔ امام مالک بڑے صاحب الرای ہیں ان سے فاضل مقالہ نگار نے تعرض نہیں کیا اور ان کے صلاح ومشورہ دینے کے ساتھ ''ہرمز'' کا تذکرہ نہیں کیا جو بہت بڑے صاحب الرائ تھے اور ان کے اثرات امام مالک پر مرتب ہوئے ہیں۔ (دیکھیے تاریخ المذاہب الاسلامیہ از امام ابوزہرہ، دارالفکر العربی، قاہرہ، ص ۳۹۱)

اسی مقالہ میں تیسرا تسامح یہ ہے کہ مصنف نے علامہ ابن قیم کی کتاب اعلام الموقعین عن رب العالمین سے استفادہ کم کیا ہے، جبکہ اس میں بہت سی مثالیں دی گئی ہیں حنفیوں اور مالکیوں کی، جہاں احادیث کو چھوڑ کر رائے پر عمل کیا گیا ہے۔ امام مالک کے یہاں یہ کیفیت

زیادہ ہے۔ اگر فاضل مکرم عمار صاحب حضرت امام مالکؒ کا مقابلہ رائے اور قیاس میں حضرت امام ابوحنیفہؒ سے کرتے تو حقیقت واضح ہوجاتی کہ امام مالکؒ زیادہ بڑے اصحاب الرای میں سے ہیں۔

فقط والسلام

احتشام احمد ندوی

کتبِ مطبوعہ، جدیدہ یا موصولہ

شعبۂ اسلامک اسٹڈیز،
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی
۲۲/۵/۲۰۱۵ء

مدیر محترم ماہنامہ ''معارف''، اعظم گڑھ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عرض یہ کہ معارف (مئی ۲۰۱۵ء) کے شمارہ میں ''رسید کتب'' کے تحت راقم کی نئی کتاب (قرآنی دروس۔ حصہ اول ودوم) کا بھی ذکر ہے۔ اس کے ناشر کے طور پر ''ادارہ علوم القرآن، شبلی باغ، علی گڑھ'' درج ہے، جب کہ یہ کتاب ''دینیہ اکادمی، مدرسہ دینیہ، غازی پور'' سے شایع ہوئی ہے، جیسا کہ اس کے ٹائٹل کور پر اور اندر پرنٹ لائن میں بھی مندرج ہے۔ ادارہ علوم القرآن کا نام ''ملنے کے دیگر پتے'' کے تحت دیا گیا ہے۔

دوسرے معارف میں اس مستقل کالم کا عنوان مختلف شماروں میں مختلف طور پر (رسید کتب/رسید مطبوعہ کتب/رسید مطبوعات جدیدہ) دیا جاتا ہے۔ بہتر ہوگا کہ کوئی ایک عنوان متعین کردیا جائے۔ ناچیز کی رائے میں ''رسید کتبِ موصولہ'' زیادہ موزوں رہے گا۔

والسلام

ظفر الاسلام اصلاحی

آثار علمیہ وتاریخیہ

حیات سعدی اور مولانا حالی
علامہ شبلی کے قیام علی گڑھ کے ابتدائی دنوں کی ایک نادر تحریر

اشتیاق احمد ظلی

اس عالم آب وگل میں مولانا الطاف حسین حالی (۱۹۱۴-۱۸۳۷) کا ورود مسعود علامہ شبلی نعمانی (۱۹۱۴-۱۸۵۷) سے بیس سال پہلے ہوا لیکن اس دار فانی سے عالم جاودانی کے لیے دونوں صرف چند دن آگے پیچھے رخصت ہوئے۔ ۱۸۸۳ میں علامہ شبلی کی علی گڑھ سے وابستگی کے بعد دونوں بزرگوں میں نہایت مخلصانہ تعلقات استوار ہوئے اور آخری وقت تک برقرار رہے۔ مولانا حالی کے سلسلہ میں علامہ شبلی کی سب سے پہلے شائع ہونے والی تحریر ''حیات سعدی'' پر ان کا مختصر تبصرہ ہے جو ''حیات سعدی اور مولانا حالی'' کے عنوان سے انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے ۲۲/اپریل ۱۸۸۶ کے شمارہ میں چھپا۔ علی گڑھ میں مولانا کی تصنیفی زندگی کا آغاز عام طور سے ۱۸۸۷ کو مانا جاتا ہے جب ان کا مشہور مضمون ''مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم'' اور ''المامون'' کی اشاعت ہوئی۔ لیکن گزٹ میں زیر نظر تحریر اور بعض دوسری تحریریں اس سے پہلے شائع ہو چکی تھیں (۱)۔ اس تبصرہ کی اشاعت سے پہلے بھی علامہ شبلی ''حیات سعدی'' کے بارے میں ایک خط میں اپنے تاثرات کا واضح طور پر اظہار کر چکے تھے۔ ۱۰/ مارچ ۱۸۸۶ کو وہ مولوی محمد سمیع صاحب کو اس کتاب کے بارے میں لکھتے ہیں: ''ایک کتاب حال ہی میں مولوی حالی صاحب نے لکھی ہے اور مجھ کو تحفۃً بھیجی ہے۔ یہ شیخ سعدی کی نہایت دلچسپ محققانہ سوانح عمری ہے۔ میں نے بے اختیار تمہارے لیے پسند کیا ہے اور مولوی حالی صاحب کو لکھ دیا ہے کہ وہ تمہارے نام بھیج دیں۔ دیکھو کہیں واپس نہ جائے۔ قیمت ۴ روپے ہے۔ واقعی بے مثل ہے اور تم کو اپنے پاس رکھنا ضروری ہے۔ اور بھی خریدار پیدا کرنے چاہئیں (۲)''۔ اس کتاب کے سلسلہ میں

ان کے احساسات کا اندازہ اس نوٹ سے بھی لگایا جا سکتا ہے جو انہوں نے شعر العجم میں شیخ سعدی کے تذکرہ کی مناسبت سے لکھا ہے۔ ''مولوی الطاف حسین صاحب حالی نے ''حیات سعدی'' میں سعدی کے حالات اور شاعری پر جو کچھ لکھ دیا ہے اس کے بعد کچھ لکھنا بے فائدہ ہے لیکن بعض تعلیم یافتہ دوستوں نے حد سے زیادہ اصرار کیا اور آخر مجبوراً لکھنا پڑا (۳)''۔ اس تبصرہ میں بعض امور کے سلسلہ میں علامہ شبلی نے کسی قدر تحفظات کا اظہار بھی کیا ہے جو اس طرح کی کسی تحریر کا ضروری جزء ہے لیکن بحیثیت مجموعی انہوں نے اس علمی اور تحقیقی کاوش کو جس طرح سراہا ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس تبصرہ اور مذکورہ بالا خط کی روشنی میں ''حیات سعدی'' کی تاریخ اشاعت کو بھی متعین کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری نے ''فکر و نظر'' کے ''حالی نمبر'' میں ''حیات سعدی'' کے پہلے ایڈیشن کی تاریخ ۱۸۸۸ بتائی ہے۔ یہ ایڈیشن مطبع مجتبائی، لاہور سے چھپا تھا (۴)۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی کی تحقیق کے مطابق یہ کتاب غالباً ۱۸۸۴ میں لکھی گئی (۵)۔ یہ دونوں تاریخیں محل نظر ہیں۔ ''گزٹ'' میں اس تبصرہ کی اشاعت اور مولوی محمد سمیع کے نام علامہ شبلی کے خط کو سامنے رکھا جائے تو صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب غالباً ۱۸۸۶ کے اوائل میں شائع ہوئی ہوگی۔ البتہ یہ معلوم کرنے کا کوئی قرینہ نہیں کہ یہ کتاب کہاں سے اور کس کے زیر اہتمام شائع ہوئی۔ بعد میں میر ولایت حسین صاحب آنریری منیجر بک ڈپو، مدرسۃ العلوم نے اس کا ایک ایڈیشن مفید عام پریس، آگرہ سے شائع کرایا تھا۔ بدقسمتی سے اس پر کوئی تاریخ درج نہیں۔ لیکن مولانا حالی کے نام کے ساتھ شمس العلماء لکھا گیا ہے، اس سے واضح طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ ایڈیشن مولانا حالی کو یہ خطاب ملنے کے بعد منظر عام پر آیا۔ مولانا کو یہ خطاب ۱۹۰۳ میں تفویض کیا گیا۔ چنانچہ یہ ایڈیشن اس تاریخ کے بعد ہی کسی وقت شائع ہوا ہوگا۔ لیکن اس ایڈیشن کے ٹائٹل پیج کے نیچے حاشیہ میں ایڈیشن دوم لکھا ہوا ہے۔ حالانکہ یہ معلوم ہے کہ ۱۸۸۶ کے بعد اور ۱۹۰۳ سے پہلے اس کتاب کے کم از کم دو ایڈیشن ۱۸۸۸ اور ۱۸۹۷ میں بالترتیب مطبع مجتبائی، لاہور اور مطبع مجتبائی، دہلی سے شائع ہو چکے تھے (۶)۔ اس صورت میں اس ایڈیشن کو ایڈیشن دوم کیسے کہا جا سکتا ہے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ یہ کالج کی طرف سے شائع کیا جانے والا اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن ہو۔ اگر ایسا ہے تو پہلا ایڈیشن کب چھپا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ۱۸۸۶ کا ایڈیشن کالج کی طرف سے شائع ہوا تھا۔ بدقسمتی سے نہ تو تبصرہ میں اس کا کوئی ذکر ہے اور نہ ''گزٹ''

میں کہیں اور۔ چنانچہ جب تک خود کتاب کہیں دستیاب ہو جائے یا اس سلسلہ میں کوئی پختہ ثبوت نہ مل جائے اس سلسلہ میں کوئی حتمی بات کہنا ممکن نہیں۔ اس امر میں البتہ شبہ کی گنجائش نہیں کہ اس مشہور زمانہ کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۸۸۶ میں شائع ہو چکا تھا۔

علامہ شبلی کی یہ نادر تحریر شائقین کی خدمت میں پیش ہے:

حیات سعدی اور مولانا حالی

مولانا حالی سے ملک کو اب تک اگر یہ شکایت تھی کہ ان کا ابر کرم ایک ہی سمت برس کر رہ گیا یعنی ان کی جادو بیانی صرف نظم اردو پر محدود رہی تو حیات سعدی نے یہ شکایت بھی دور کر دی۔ اب نثر اردو کو یہ فخر حاصل ہے کہ مولانا حالی کی نگاہِ التفات نے ادھر بھی رخ کیا۔

ملک کے جو نامور مصنف اردو زبان میں معلومات سودمند کا ذخیرہ مہیا کر رہے ہیں ان میں مولوی حالی صاحب کا قدم سب سے آگے ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ سعدی ایسے شخص کی لائف سینکڑوں دلچسپ اور پر مزہ واقعات سے معمور ہوگی مگر افسوس کہ مصنف کو جو کچھ اس خزانہ سے ہاتھ آیا وہ من میں چھٹانک بھی نہیں۔ مصنف کا یہ عذر بالکل صحیح ہے کہ جن تصنیفات سے اس کو مدد ملنے کی امید تھی وہ آپ کم مایہ تھیں۔

جس دریا سے اس نے چشمہ نکالا وہ خود پایاب تھا۔

ادھر مصنف کو یہ بھی منظور تھا کہ وہ کوئی بات تاریخی سند کے بغیر زبان سے نہ نکالے ورنہ اگر ''آب حیات'' کے مصنف کی طرح وہ بھی بازاری قصوں کو آب و رنگ دے کر لکھنا چاہتا تو مضمون کی تعداد بہت کچھ بڑھا دیتا جس کے ساتھ عوام سے اس کو حسن قبول کی سند بھی مل جاتی۔

غرض لائف کے متعلق تو مصنف کو حسرت کے ساتھ انہی پہلے تذکروں اور تصانیفوں کا دست نگر رہنا پڑا جن کے دامن میں چند خزف ریزوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ لیکن جہاں شیخ کی تصنیفات اور اس کی شاعری کے متعلق نکتہ سنجی کی ہے وہ مصنف کی طباعی اور سخن دانی کا مشہور اور نامور میدان ہے۔

کس موشگافی سے اس نے دکھایا ہے کہ سعدی کا نظم نیچرل خوبیوں کے لحاظ سے کس قدر

اپنی ہمسر تصنیفات سے ممتاز ہے۔ واقعی جن محفلوں میں صراحی کے قہقہہ اور قلقل مینا کے سوا کوئی اور صدا نہ بلند ہو وہاں وعظ و پند کے سوکھے فقرے سنا کر اہل بزم کو اپنی طرف کھینچنا سعدی ہی کی سحر طرازی اور اعجاز بیانی کا اثر ہے۔

مولانا حالی ہی نے لوگوں کو یہ خیال دلایا کہ جس زمانہ میں شخصی حکومتوں کے قبضہ میں آزادی کا سبق بھول چکی تھی اس وقت بھی سعدی ایسے حق پرست موجود تھے جو آزادی پر جان دیتے تھے اور جن کی نظیر آج بھی بمشکل مل سکتی ہے۔ ناظرین شاید بعض باتوں میں مصنف سے الجھوں مثلاً اس بات میں کہ انہوں نے جب سعدی کی ایک ایک بات کی حمایت کی تو اس حکایت کا ''قضارا من و پیرے از فاریاب'' جس میں ایک سپر نیچرل واقعہ کا ذکر ہے کیا جواب دیں گے۔ یا نظامی کے مقابلہ میں سعدی کے رزمیہ اشعار پیش کرنے یا پانچویں باب گلستاں کی بعض فحش حکایتوں کے ذکر سے چشم پوشی کرنے یا واقعہ سومنات کی زبردستی تاویل کرنے اور اس قسم کی بعض باتیں۔ مگر حق یہ ہے کہ اس قسم کی رائیں اجتہادات میں شامل ہیں جس میں ہم کسی مجتہد کی زبان نہیں پکڑ سکتے اس کے علاوہ کسی پر قضا باغ کی خوبی اس وجہ سے کم نہیں ہو جاتی کہ جہاں اس میں ہزاروں خوش نما پھول ہیں وہیں دو ایک خار بھی ہیں۔

شبلی

۱۹/اپریل ۱۸۸۶

حواشی

(۱) 'علماء اسلام' اور 'وہ غلطی زیادہ خطرناک ہے جو انسان کو اپنی نسبت آپ ہو' کے عنوان سے علامہ شبلی کے دو مضامین گزٹ میں بالترتیب ۱۴/اپریل ۱۸۸۳ء اور ۲۱/جولائی ۱۸۸۳ کو شائع ہو چکے تھے۔ (۲) مکاتیب شبلی، مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۰، حصہ اول، ص ۷۹۔ (۳) علامہ شبلی نعمانی، شعر العجم، دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ، ۲۰۱۰، حصہ پنجم، ص ۲۵۔ (۴) محمد ضیاء الدین انصاری، نقش حالی، مشمولہ سہ ماہی فکر و نظر حالی نمبر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، اکتوبر، ۱۹۹۱، ص ۱۷۱۔ (۵) شجاعت علی سندیلوی، تصانیف حالی، مشمولہ ماہنامہ فروغ اردو، حالی نمبر، حصہ اول، ج ۵، ش ۹، فروری ۱۹۵۹، ص ۱۶۔ (۶) محمد ضیاء الدین انصاری، ص ۱۷۱۔

ادبیات

حمد

جناب کوثر اعظمی

بیا و ببیں عالم زرنگار | دل آویز نیرنگی روزگار
ایں ابر و مہ و باد ، آبِ رواں | زمیں ، گلستاں و فلک ، کہکشاں
ہمہ روئے زیبائے صد حکمتش | ہمہ جود و اعطائے صد رحمتش
ندانی کہ آرد بہ از نیستی | در ہستی ہمہ را و تو کیستی
کہ عظمت دہد ایں ترا کوثرا ! | کہ گرداند از خاک خاور ترا
کہ بخشد ترا دین و دانش ، تمیز | دلِ آرزومند و جانِ عزیز
خداوندِ ما برتر و سرور است | جہاں آفریں و جہاں پرور است
کہ بر خلق پروردگاری بہ اوست | جہاں داری و کرد گاری بہ اوست
بہ از ہر بنِ مو، بیا ! شکر کن | نہ زیبد بایں معرفت کفر کن

اے کہ تجھ سے تھی جواں غزلوں کی تہذیب کہن
(ڈاکٹر کلیم عاجز کے سانحۂ ارتحال سے متاثر ہوکر)

جناب وارث ریاضی

اے کہ تجھ بن ہے بہت سونی غزل کی انجمن
نازشِ علم و ادب ، اے شاعرِ شیریں سخن
اے غزل کی آب رو ، رنگیں نوا ، میرِ سخن
اے کہ تجھ سے تھی جواں غزلوں کی تہذیب کہن

خوب صورت تھی ترے دم سے عروسِ شاعری
زیب دیتا تھا اسے غزلوں کا دل کش پیرہن

طویٰ، اعظم گڑھ۔

کاشانۂ ادب سکٹا دیوراج، پوسٹ بسوریا، وایا لوریا، مغربی چمپارن، بہار، ۸۴۵۴۵۳۔

گیسوے صنفِ غزل میں عمر بھر شانہ کیا
تو نے سلجھائی بہت غزلوں کی زلفِ پُرشکن

تو نے اس انداز سے چھیڑا غزل کے ساز کو
جھوم اٹھتے تھے ترے نغموں پہ مرغانِ چمن

تیرا انداز بیاں دل کش ، ترنم دل نواز
جاذب فکر و نظر تیری غزل کا بانکپن

کیا غضب کی گنگنانے میں ترے ، تاثیر تھی
بھول جاتے چوکڑی بھرنا غزالانِ خُتَن

ہر غزل تیری گدازِ عشق کی آئینہ دار
سوز سے تیری غزل کے دل میں ہوتی ہے چبھن

تیرا ہر شعر بخشے ہے سرورِ آگہی
ذکر تیری شاعری کا انجمن در انجمن

غزل

ڈاکٹر رئیس احمد نعمانی

جو جھوٹ پہ مبنی تھا وہ قصہ نہیں لکھا
ہاں ، قطرے کو ہم نے کبھی دریا نہیں لکھا

آتا ہی نہیں ہم کو فنِ ابلہ فریبی
ہم نے شبِ یلدا کو سویرا نہیں لکھا

سچ یہ بھی ہے ، موہوم سی امید سحر پر
ہم نے شبِ آلام کا نوحہ نہیں لکھا

ہے یوں بھی کہ بے دیکھے بھی لکھا ہے سب کچھ
ایسا بھی نہیں ہے کہ جو دیکھا ، نہیں لکھا

ہم طالبِ حق تھے نہ ہٹے موقفِ حق سے
کیا کیا نہ کہا لوگوں نے ، کیا کیا نہیں لکھا

کردار سے ثابت بھی کیا ہے اسے اپنے
بے وجہ اب وجد کا مدیحہ نہیں لکھا

ہر لفظ میں ہم نے رئیسؔ اک بات کہی ہے
اشعار کے قالب میں معما نہیں لکھا

گوشۂ مطالعات فارسی، پوسٹ بکس نمبر ۱۱۴، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱۔

مطبوعات جدیدہ

تاریخ اسلام کے علمی ذخائر ۔ایک تجزیاتی مطالعہ: از پروفیسر خورشید احمد فارق، ترتیب وتصحیح پروفیسر محمد نعمان خاں، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۸۰، قیمت ۱۵۸ روپے، پتہ: البلاغ پبلی کیشنز، N-1 ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔

دسویں صدی ہجری کے قاضی مجیرالدین حنبلی کی کتاب الانس الجلیل، گذشتہ صدی کے مشہور عربی ادیب ومورخ جرجی زیدان کی تاریخ مصر الحدیث اور امیر شکیب ارسلان کی تاریخ غزوات العرب ان تینوں میں زمان ومکان کے تفاوت کے باوجود اسلام کی تاریخ کے مطالعہ کا رشتہ، مشترک ہے۔ زبان ظاہر ہے عربی ہے، اردوداں طبقہ میں یہ کتابیں خصوصاً اول الذکر کتاب قطعی غیر معروف ہے، لیکن ان کی اہمیت کا تقاضا تھا کہ اردو کے سنجیدہ قارئین سے ان کا تعارف کرایا جاتا اور اس کے لیے پروفیسر خورشید احمد فارق کی نگاہ انتخاب کی موزونیت سے کسے انکار ہوسکتا ہے۔ قریب تیس چالیس سال پہلے فارق مرحوم کا نام علمی حلقوں میں معروف ہی نہیں محترم ومشہور بھی تھا۔ تاریخ اسلام اور اس کے پہلے دور کے وہ متخصص عالم ومحقق کی حیثیت سے نمایاں ہوئے۔ اس کتاب کے فاضل مرتب کے ذریعہ ایک بار پھر فارق مرحوم کے علمی انہماک اور ان کے اس خاص مزاج کی یاد تازہ ہوگئی کہ وہ ایسے مواد کی تلاش میں رہتے تھے جو عام کتابوں میں دستیاب نہ ہو۔ وہ ایسی ہی کتابوں کا مطالعہ، جائزہ اور تجزیہ کرتے، برہان اور ندوۃ المصنّفین میں ان کے کچھ تجزیے شائع بھی ہوئے۔ زیر نظر کتاب سے معلوم ہوا کہ یہ تجزیے، ۱۹ جلدوں میں ہیں جو کچھ دستیاب ہیں اور کچھ کے بارے میں کوئی علم نہیں۔ زیر نظر کتاب اسی سلسلہ کا ۱۷واں حصہ ہے، مرتب نے اس حصہ کو اشاعت کے لیے اس لیے منتخب کیا کہ دستیاب جلدوں میں یہ آخری ہے اور مختصر بھی۔ حق یہ ہے کہ مختصر ہونے کے باوجود زیر نظر حصہ قدر وقیمت میں کسی درجہ کم نہیں۔ مثال کے طور پر قاضی مجیرالدین حنبلی کی کتاب میں بیت المقدس کی از اول تا آخر مکمل تاریخ آگئی ہے، ایک سو پچانوے فصلوں میں منقسم یہ تاریخ سورۃ الاسراء اور مسجد اقصیٰ کے ناموں سے شروع ہوتی ہے۔ تخلیق کائنات اور آدمؑ

اور دوسرے انبیائے کرام کے ذکر سے سلطان صلاح الدین ایوبی اور ملک الناصر صلاح الدین داؤد تک بیت المقدس کے وجود کی ہر لہر اس کو معلومات کا سمندر بنا دیتی ہے۔ فارق مرحوم نے اسی بحر کی غواصی کی اور جو موتی سب سے بیش قیمت تھے ان کو تلاش کے بعد پیش کر دیا۔ روایات کی واقعیت اپنی جگہ لیکن بذات خود روایات کی دلچسپی قارئین کے ذوق مطالعہ کو حسن و کمال تو عطا ہی کرتی ہے، معلومات کی ایک نئی دنیا کا انکشاف بھی کرتی جاتی ہے۔ ان تینوں کتابوں کے اقتباسات فارق مرحوم کے حسن انتخاب کی بھی دلیل ہیں۔ فاضل مرتب لائق تبریک و تحسین ہیں کہ انہوں نے ایسی قیمتی، مفید اور دلچسپ کتاب کو پانے اور دوسروں تک پہنچانے کی توفیق پائی۔ ساتھ ہی ایک بہت اچھا مقدمہ لکھا، ترتیب و تدوین کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا۔ حواشی کا اہتمام کیا اور سب سے بڑھ کر ایک نہایت قیمتی امانت کو ضائع ہونے سے بچالیا۔

مکاتیب مشاہیر ندوۃ العلماء بنام حضرت مولانا محمد عمران خاں ازہری ندوی: ترتیب مولانا پروفیسر محمد حسان خاں، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات ۳۱۹، قیمت ۳۵۰ روپے، پتہ: مکتبہ دین و دانش، ۱۲- مسجد شکور خاں روڈ، بھوپال، ایم پی۔

اس سے پہلے مشہور عالم، مبلغ، منتظم مولانا محمد عمران خاں ندوی کے نام دارالمصنّفین کے مشاہیر کے خطوط کا ایک مجموعہ چھپ چکا ہے اور مقبول بھی ہوا ہے، معارف میں اس کے ذکر میں کہا گیا تھا کہ اس اشاعت کا مقصد یہ احساس ہے کہ ایک مجسم عمل زندگی کی شخصیت کا مطالعہ کرنے میں یہ خطوط بہت معاون ثابت ہوتے ہیں۔ کیونکہ انسان، معاشرہ میں خواہ کتنے ہی بڑے مقام پر فائز ہو، اس کا اصل عکس اس کے ذاتی اور نجی خطوط کے آئینہ میں زیادہ واضح اور روشن نظر آتا ہے۔ ایک بات اور ہے کہ علماء و مصلحین کے خطوط کے بیشتر مجموعے دیکھا جائے تو پڑھنے والوں کے لیے سرمایہ حکمت اور سرمہ بصیرت سے کم نہیں ہوتے، مولانا بھوپالی ندوی کے سوانح میں ندوہ، دارالمصنّفین اور تبلیغ کے رنگ سب سے گہرے ہیں، خصوصاً ندوہ ان کی کتاب زندگی کا سب سے نمایاں باب ہے، ندوہ کی تاریخ، ان کے بغیر مکمل نہیں، ۳۹ء کے ایک خط میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کا یہ جملہ، مولانا بھوپالی کی شخصیت کے عرفان کا بلیغ ترین دیباچہ ہے کہ ''ہم سب خام ثابت ہوئے، آپ ہی پختہ نکلے'' قریب نصف صدی تک ندوہ اور اس کے مشاہیر سے خط و کتابت، گویا

اس عہد کی تاریخ کا دلچسپ بیان ہے، مولانا عبدالباری ندوی، ڈاکٹر سید عبدالعلی، مولانا علی میاں، مولانا منظور نعمانی، رئیس احمد جعفری، مولانا ابوالعرفان ندوی کے سینکڑوں خطوط کے علاوہ اس فہرست میں مولانا عبدالماجد دریابادی کے خطوط بھی ہیں جو اگرچہ ندوہ سے باضابطہ منسلک نہیں تھے لیکن علامہ شبلی، خانوادہ حسنی اور مولانا بھوپالی کے مثلث میں ان کا ہر زاویہ مساوی بھی تھا اور قائمہ بھی۔ یہ خطوط وقت کے نشیب و فراز اور بنتے بگڑتے تعلقات و خیالات کی وجہ سے جہاں کہیں حیرت کا سبب بنتے ہیں وہیں اگر ان کو انسانوں کی گفتگو سمجھا جائے تو حیرت سے زیادہ مسرت اور افادیت عطا کرتے ہیں، ایسے مفید اور اہم خطوط کی اشاعت کے لیے مرتب شکریہ کے مستحق ہیں اور وہ بھی جنھوں نے برسوں ان خطوط کی حفاظت کی اور نقل و تصحیح کی ذمہ داری نبھائی۔

اردو سفرناموں کا تنقیدی مطالعہ: از پروفیسر خالد محمود، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات ۳۲۷، قیمت ۱۰۸ روپے، پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، ممبئی، علی گڑھ۔

اردو ادب میں سفرناموں کا چلن شروع ہوا اور قبول ہوتا گیا اور اس کی وجہ وہی ہے جو اس کتاب کے فاضل مصنف نے بھی بیان کردی ہے کہ یہ پرکشش بیانیہ ہے۔ مسافر یا سیاح کا طرز نگارش اس کو مزید پرکشش بنا دیتا ہے۔ اس کشش اور مقبولیت کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ اردو سفرناموں کا کوئی مکمل اشاریہ آج تک سامنے نہیں آسکا، چند تحریریں ضرور ہیں لیکن وہ "مکمل" نہیں کہی جاسکتی، ایسے میں سفرناموں کے تنقیدی مطالعہ کا تصور اور اس کی تیاری صاحب مقالہ کی جودت طبع و ہمت بلند کی داد طلب ہے، مصنف نے اس تنقیدی مطالعہ کو مقالہ کا نام دیا ہے اور پانچ اہم ابواب پر نظر ڈالنے ہی سے اندازہ ہوتا ہے کہ سفر، اقسام سفر، سفر و سیاحت کا فرق، سفرنامے کا فن، تاریخی ارتقا وغیرہ بنیادی باتوں پر بحث اور مفید بحث تو آہی گئی ہے، اور ابواب میں اردو کے پہلے سفرنامے سے ۱۹۴۷ تک کی روداد اور پھر عصر حاضر میں ان سفرناموں کی سمت و رفتار پر ایسے معلومات پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جن سے تکمیل کی تشنگی کا شکوہ نہیں رہ جاتا۔ مطالعہ میں تنقید کا فریضہ بھی ساتھ ساتھ ہے، کمبل پوش کے سفرنامہ کی خوبیاں واضح کرنے کے بعد یہ بھی ہے کہ اس نے لندن کو صرف سطحی نظر سے دیکھا، کمبل پوش نے انگلستان کی سیر کی اور سرسید نے بھی لیکن مسافروں کی منزل کیا تھی، نظر اس پر رہے ایک صرف سیر و سیاحت کا شیدا اس لیے لندن کے حسن پر فریفتہ، سرسید بھی

متاثر مگر اثر ان کے ہوش وحواس پر غالب نہیں، مقصد اور تعلیمی مقصد ہمیشہ پیش نظر۔ شبلی کا سفرنامہ مصروشام، مصنف کی نظر میں اردو کے خزانے کا بیش بہا سرمایہ ہے، ان کے نزدیک شبلی کے اندر ایک سچے سیاح کی روح موجود تھی، مولوی حسین آزاد نے ایران کی سیر کی اور ایسی منظر کشی کی کہ خود اسی منظر کا حصہ معلوم ہونے لگے، ان کی نثر پر نظر ضروری تھی، اس لیے لکھا گیا کہ اگرچہ آب حیات والی نثر سے پرہیز کیا گیا ہے لیکن اسلوب کو کیا کیا جائے جو پڑھنے والے کو سحر زدہ کیے بغیر نہیں رہتا۔ حج کے سفرناموں کا بھی مختصر جائزہ ہے، ان کو الگ اس لیے بیان کیا گیا کہ حج کا سفر دوسرے تمام اسفار سے ممتاز اور مقصد کے اعتبار سے مختلف ہے۔ معلومات اور صاحب کتاب کے حسن اخذ وانتخاب کی وجہ سے اس کتاب میں جاذبیت بھی ہے اور افادیت بھی۔

شہریار: مرتبہ جناب سرور الہدیٰ، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ وطباعت مجلد مع گرد پوش، صفحات ۸۳۶، قیمت ۶۰۰ روپے، پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی اور علی گڑھ اور پٹنہ کے مکتبے۔

اردو شاعری کے بڑے ناموں کی فہرست میں شہریار نام بھی ہے۔ شہرت اور مقبولیت ان کو خاصی ملی، گرچہ اس میں وقت لگا، مگر شناخت اور احترام کے ساتھ شناخت ان کی شاعری کے ابتدائی دور ہی اس طرح قائم ہوئی کہ اچھے سخن شناسوں کی نظر میں ان کے وہ رنگ اور عناصر آ گئے جو کسی شاعر کو نمایاں اور منفرد بناتے ہیں۔ ابھی پہلا مجموعۂ اشعار تیار ہی ہوا تھا کہ کہا گیا کہ یہ تو کوئی اور ہے جو اپنی تلاش میں ہے، اپنے اندرون کی جستجو میں سرگرداں، اور اب تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ عمر بھر یہ جستجو جاری رہی، جس کی تلاش تھی اس کی یافت ہوئی یا نہیں، مگر شاعر کو یہ اطمینان ضرور ملا کہ اس بہانے سے دنیا تو بہر حال دیکھ لی گئی، انا وغیر کی یہی کشمکش، بڑی شاعری کا سبب بنتی رہی ہے۔ آرزو بکھر کر ہی نغمہ کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہر موزوں طبع کی قسمت میں یہ شعور کہاں آتا ہے کہ ع وجود خاکی میں جسم کچھ زیادہ تھا۔

ایسی جدت اظہار، صرف پڑھنے والوں ہی کے لیے نہیں، پرکھنے والوں کے لیے کشش کی وجہ کیوں نہ ہوتی، اس کتاب میں ایسے ہی مطالعات کو جمع کیا گیا ہے۔ ایک ہی مرکز پر مختلف زاویہ ہائے نظر کا ارتکاز، ہمارے عالم تنقید کی نیرنگیوں کا بڑا دلچسپ منظر بن گیا، خلیل الرحمٰن اعظمی سے سرور الہدیٰ

تک اس بزم میں وہ سارے سخن بلکہ ہنرور موجود ہیں جن کے دم یا ہنگامہ پر اردو کے تنقید گھر کی رونق موقوف ہے۔شخصیت،فکر وفن، تجزیے،تبصرے،مکالمے جیسے ابواب نے کتاب کو ضخیم تو کیا ہی، وقیع بھی بنادیا۔اس کے لیے یہ احساس بھی اثر انداز ہوا کہ شہر یار کی شخصیت اور شاعری پر کوئی باضابطہ کتاب موجود نہیں ، باضابطہ کتاب تو یہ مجموعہ مضامین بھی نہیں لیکن یہ کئی باضابطہ کتابوں کے لیے سب سے مفید ماخذ ضرور ہے۔خوبصورت جملے،فکر انگیز عبارتیں خوب ہیں، کچھ آسانی سے اور کچھ بڑی مشکل سے،فہم کی دسترس میں آنے والی۔دوسرے کچھ کہیں لیکن جب کلیم عاجز کہتے ہیں کہ شہر یار تو میری طرح فقیر بے مثال ہے تو تحفظات کے اسیروں کو بھی اعتراف کے اس لمس کا احساس ہوتا ہے جس کو بآسانی خوشگوار کہا جا سکتا ہے۔قریب سو عنوانوں میں غالب حصہ شاعری کا ہے، شخصیت پر آٹھ تحریریں ہیں،سوانح کے روایتی انداز کی کمی کے باوجود،ایک پیکر ضرور سامنے آجاتا ہے، چار متوازی لیکن متساوی نقطے والے غضنفر کا مضمون غالباً سب سے متوازن نظر کا احساس دلاتا ہے لیکن ان کی یہ تعبیر سمجھ میں نہ آئی کہ ''جیسے کوئی جدید اور شفیق باپ''۔شہر یار کی نثر نگاری پر دو مضامین ہیں اور یہ اہمیت میں کسی درجہ کم نہیں،علی گڑھ کے رسالہ خیر وخبر میں ان کی تحریریں،نظم ونثر کے بنیادی فرق کا گویا اعلان ہیں،خود کلامی،تخاطب میں اور تحیر،تعقل میں کیسے بدلتا ہے؟ ثاقب عمران نے بڑی خوبی سے ان سوالوں کے جواب فراہم کر دیے،شاعری،تحقیق وتنقید کا ذوق رکھنے والوں کے لیے وہ حصہ بھی بہت کار آمد ہے جہاں شہر یار مصروف گفتگو ہیں اور داد کے قابل، لائق مرتب کا پیش لفظ بھی ہے جس میں مجموعہ کا پورا عطر آ گیا ہے۔

انفرادیت کی تلاش : از ڈاکٹر آفاق فاخری ،متوسط تقطیع ،عمدہ کاغذ و طباعت،مجلد،صفحات ۱۵۲، قیمت ۱۴۰ روپے، پتہ: ڈاکٹر آفاق فاخری،محلّہ قاضی پورہ،جلال پور،امبیڈکر نگر اور دہلی ولکھنؤ کے دیگر مکتبے۔

آفاق فاخری کی شہرت میں بڑا دخل ان کی شعری صلاحیتوں کے اظہار کا ہے۔خوش فکر ہیں، خوش گلو بھی ہیں۔لیکن زیر نظر کتاب،نثر میں بھی ان کی خوش نظری کی شہادت دیتی نظر آتی ہے،فضا ابن فیضی،ابوالمجاہد زاہد،ناوک حمزہ پوری،ظہیر غازی پوری، پروفیسر عبدالمغنی،شبنم سبحانی،مدحت الاختر بیکل اور رام لعل وغیرہ جیسے شاعروں،محققوں،نقادوں اور افسانہ نگاروں کی کاوشوں کو فن وفکر کی میزان پر

رکھنے میں جس انصاف وتوازن کا مشاہدہ اس کتاب سے ہوتا ہے وہ مسرت کا سبب ہے، فضا ابن فیضی کے اعتراف فضل میں تنقید کے گونگے پن کا احساس ہوتا ہے، ایسے میں مصلحت نا آشنا نوجوان کا یہ تیور اچھا لگتا ہے کہ اسلوب اردو کی بھی انفرادیت اور لہجے کے اچھوتے پن کی وجہ سے فضا ایک صاحب طرز شاعر ہیں جن کی تقلید اور تتبع آسان نہیں۔ایک اور جگہ یہ جملہ بھی اچھا لگا کہ اسلامی ادب، ادیب کی شخصیت کے سوز دروں کو اعلیٰ فنی محاسن سے آراستہ کرتا ہے۔فکر ونظر اور اعلیٰ اقدار کی چاہت، دوسروں سے جدا کرتی ہے، انفرادیت کی تلاش اگر اس کتاب کا نام ہے تو یہ معنویت سے خالی نہیں۔

شعاع نوا: از جناب رئیس احمد نعمانی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۱۹۲، قیمت ۱۵۰ روپے، پتہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ اور مکتبہ جامعہ لمٹیڈ اور یونی ورسل بک ہاؤس، علی گڑھ۔

زبان پر مدحت نبوی ؐ کا چمن کھل جائے تو ثنائے رسول ؐ کے گلوں کی عطر بیزی کا بیان کیسے ممکن ہے، لیکن عقیدت کے جذبات پر بند لگانا بھی تو ناممکن ہے۔شاعر کی نعت نگاری محتاج تعارف نہیں، ان کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں ہوش کا دامن کبھی چھوٹتا نہیں۔

عرش باری سے تقابل تو ہے اک شرک مگر ‌ ‌ رتبہ رکھتا ہے بڑا خلد سے روضہ ان ؐ کا

اگر اعمال ہوں سنت کے مطابق تو رئیس ‌ ‌ مغفرت کے لیے کافی ہے حوالہ ان ؐ کا

جھکاؤ سر نہ کہیں بھی در خدا کے سوا ‌ ‌ نظر نہ ٹھہرے کہیں روئے مصطفیٰ ؐ کے سوا

تاثیر تھی کلام الٰہی کی بس رئیس ‌ ‌ ہرگز نہ شعر وسحر نبی ؐ کی صدا میں تھا

دل سے جو ان ؐ کے تابع فرمان ہوگیا ‌ ‌ اس کی تو بس نجات کا سامان ہوگیا

در پاک پر گزرتے شب وروز کاش میرے ‌ ‌ وہیں میری صبح ہوتی وہیں وقت شام ہوتا

یہ صرف چند اشعار ہیں لیکن ہوش مند عقیدت کیا ہوتی ہے اس کا اندازہ لگانے میں دشواری نہیں ہوتی اور نعت نگار شاعر کے اس یقین پر یقین کیا جا سکتا ہے کہ عقیدہ وخیال کی درستی کے بعد، فن، تخیل اور نکتہ پردازی سے فائدہ اٹھا کر شاعری (نعت گوئی) کا حق ادا کیا جا سکتا ہے، اس اجمال کی تفصیل بھی حرف ناگزیر کی صورت میں آ گئی ہے اور خوب آ گئی ہے، یہی ہونا بھی تھا کہ

نبی ؐ کے ذکر سے رفعت مرے بیان میں ہے ‌ ‌ کہ رفع ذکر کی آیت انہیں ؐ کی شان میں ہے

ع ـ ص

رسید کتب موصولہ

(۱) ارشادات نبویؐ کی روشنی میں نظام معاشرت حصہ اول: مولانا عبداللہ عباس ندوی، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، پوسٹ بکس نمبر ۱۹۹، ندوہ کیمپس، لکھنؤ۔ قیمت =/۲۵۰ روپے

(۲) اشاریہ اردو جرائد: مدیر نجیبہ عارف، بک سنٹر ادارہ تحقیقات اسلامی، فیصل مسجد، مسجد کیمپس، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد۔ قیمت درج نہیں

(۳) السلطان اورنگ زیب عالم گیر حیاتہ وعصرہ: صاحب عالم الاعظمی الندوی، دارالآفاق العربیہ، ۵۵ شارع محمود طلعت من ش الطیر ان مدینہ نصر، القاہرہ۔ قیمت درج نہیں

(۴) انشائیہ کی روایت مشرق ومغرب کے تناظر میں: محمد اسداللہ، ۳۰/ گلستان کالونی، نزد پانڈے امرائی لانس، جعفر نگر، ناگپور۔ قیمت =/۱۷۳ روپے

(۵) ایودھیا کا تنازعہ۔ رام جنم بھومی۔ فسانہ ہے حقیقت نہیں: محمد عبدالرحیم قریشی، مرکزی دفتر، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ، نئی دہلی۔ قیمت =/۲۵۰ روپے

(۶) ثنائے جلیل: نذیر فتح پوری، اسباق پبلی کیشنز، سائرہ منزل، ۱۰۲/ B/۲۳۰، ومان دانش، سنجے پارک، لوہ گاؤں روڈ، پونہ، مہاراشٹر۔ قیمت =/۸۰ روپے

(۷) سید احمد مرتضیٰ نظر: ڈاکٹر نبی ادریس، انتساب پبلی کیشنز، راؤجی مارگ سرونج، واجد لائبریری، محمدی مسجد کے سامنے، بدھوارہ، بھوپال۔ قیمت =/۲۵۰ روپے

(۸) فیوض بمھور: محمد محامد ہلال، منہاج بک ڈپو، مبارک پور، بمھور۔ قیمت =/۲۵۰ روپے

(۹) مصدقات: ڈاکٹر راہی فدائی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔ قیمت =/۱۳۵ روپے

(۱۰) نقوش دبئی (سفرنامہ): ڈاکٹر محمد عتیق الرحمٰن، مرکز تحقیقات اسلامی، گلشن عتیق نیو عظیم آبادی کالونی، صندل پور، پٹنہ۔ قیمت =/۱۱۲ روپے

تصانیف علامہ شبلی نعمانیؒ

کتاب	قیمت
سیرۃ النبیؐ جلد اول و دوم (یادگار ایڈیشن)	2000/-
سیرۃ النبیؐ	
(خاص ایڈیشن مکمل سیٹ ۷ جلدیں)	2200/-
علامہ شبلی و سید سلیمان ندوی	
مقدمہ سیرۃ النبیؐ	30/-
الفاروق	300/-
الغزالی	200/-
المامون	100/-
سیرۃ النعمان	300/-
سوانح مولانا روم	80/-
شعر العجم اول	150/-
شعر العجم دوم	130/-
شعر العجم سوم	125/-
شعر العجم چہارم	150/-
شعر العجم پنجم	120/-
الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی	350/-
(محقق ایڈیشن) تحقیق: ڈاکٹر محمد اجمل ایوب اصلاحی	
الکلام	230/-
علم الکلام	180/-

کتاب		قیمت
موازنہ انیس و دبیر		100/-
اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر		85/-
سفرنامہ روم و مصر و شام		100/-
کلیات شبلی (اردو)		180/-
کلیات شبلی (فارسی)		45/-
مقالات شبلی اول (مذہبی)		100/-
مرتبہ: سید سلیمان ندوی		
مقالات شبلی دوم (ادبی)	〃	70/-
مقالات شبلی سوم (تعلیمی)	〃	80/-
مقالات شبلی چہارم (تنقیدی)	〃	200/-
مقالات شبلی پنجم (سوانحی)	〃	150/-
مقالات شبلی ششم (تاریخی)	〃	90/-
مقالات شبلی ہفتم (فلسفیانہ)	〃	100/-
مقالات شبلی ہشتم (قومی و اخباری)	〃	110/-
خطبات شبلی	مرتبہ: عبدالسلام ندوی	80/-
انتخابات شبلی	مرتبہ: سید سلیمان ندوی	45/-
مکاتیب شبلی اول	〃	150/-
مکاتیب شبلی دوم	〃	190/-
شذرات شبلی	مرتبہ: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی	220/-

ISSN 0974 - 7346 MA'ARIF (URDU) -PRINT
JUNE 2015 Vol- 195 (6)
RNI. 13667/57 **MA'ARIF** AZM/NP- 43/016
Monthly Journal of
DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY
P.O.Box No: 19, Shibli Road, AZAMGARH, 276001 U.P. (INDIA)
Email: shibli_academy@rediffmail.com, info@shibliacademy.org
Website: www.shibliacademy.org Fax No: 05462 - 265080
Bank Name: Punjab National Bank - Heerapatti, Azamgarh
Account No: 4761005500000051 - IFSC No: PUNB0476100
✆ (Office Mobile) 7607046300